ہم غریب شہری

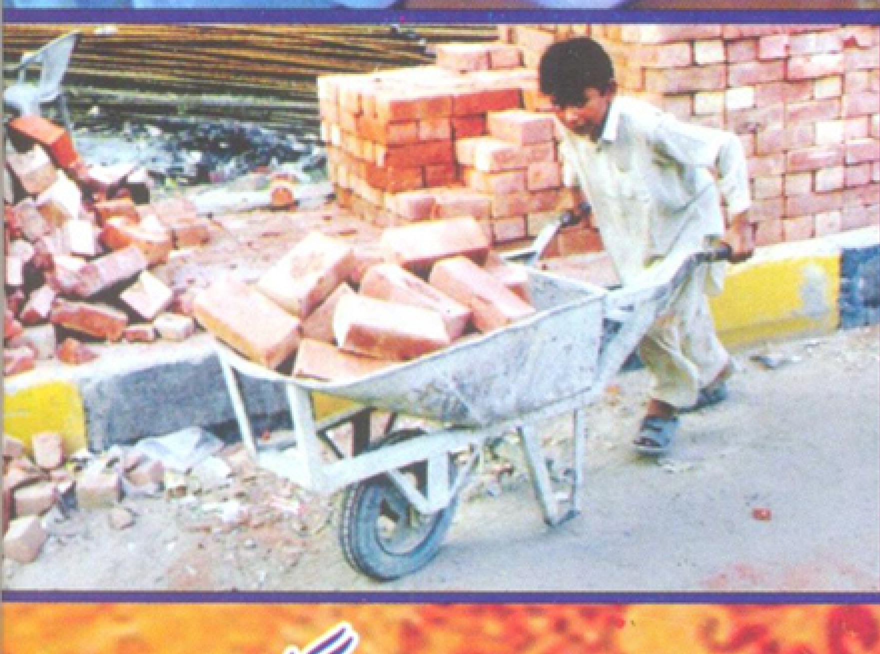

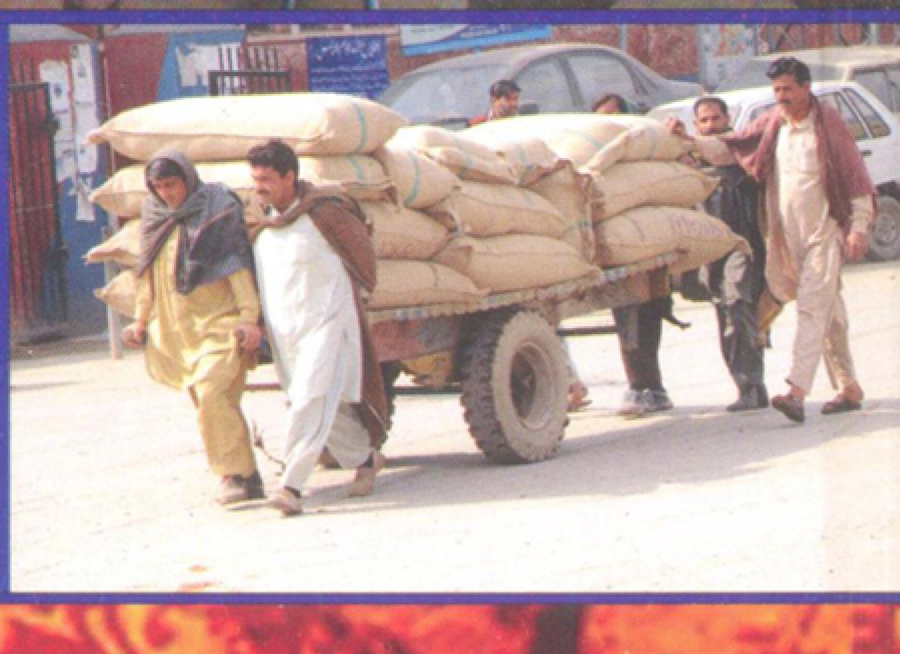

سمیرا گل

☆

ہم غریب شہری

سمیرا گل

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	بچے کی پیدائش کے بعد کے رسم ورواج	1
2	ذرائع آمد ورفت اور ذرائع معاش	8
3	رہائش-مکانات	17
4	لباس	23
5	شادی	27
6	مذہبی وثقافی تہوار	38
7	علاج معالجے کی سہولیات اور طریقہ کار	44
8	وفات کے موقع پر رسم ورواج	53
9	ٹونے ٹوٹکے سے علاج	59
10	ہمارے کھیل	61
11	ہماری خوراک	69
12	حصول تعلیم کے ذرائع	76
13	ہماری کہاوتیں	83

14	ہمارے چھابے/ پھیری والے	108
15	جھگڑے اور اُن کے حل	111
16	مزدوری/مزدور	116

پیش لفظ

اس جدید دور میں یہ کتاب عجیب لگتی ہے۔جس میں غریب شہریوں کی بودوباش،طرز معاشرت،لباس، خوراک،تعلیم اور صحت کے حصول کی سہولیات کا تذکرہ ہے۔ بے پناہ تکالیف کے باوجود شہروں کی آبادی میں تسلسل سے اضافہ ہو رہا ہے جو ریادہ تر غریب پیشوں پر مشتمل ہے۔ان بستیوں کا طرز زندگی ہمارا اثاثہ ہے جن کو اس کتاب میں اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو نہ صرف آنے والی نسل کے لیے ماضی کا جھروکا بنے گی بلکہ موجودہ ترقی یافتہ اقوام کے لیے بھی راہنما بنے گی۔ یہاں کے رہنے والوں کے لیے آئینہ بنے گی جو اچھی روایات کو جاری اور بُری روایات کو چھوڑنے پر سوچیں گے۔اپنی مٹی پر چلنے کا سلیقہ آئے گا۔لوکل وزڈم کو دوام ملے گا جو یہاں رہتے ہوئے بھی یہاں کے بارے میں کسی کو نہیں بتاتے۔ کیونکہ وہ احساس کمتری میں مبتلا کر دیئے گئے ہیں۔اُن کو یہ تاثر دیا گیا ہے کہ یہ غریبوں اور کم مراعات یافتہ طبقوں کی بستی ہے اور یہاں تعلیم سے محروم لوگوں کا جم غفیر ہے۔شاید اس بستی کی پہلی گریجویٹ خاتون سمیرا اگل ہیں جو اِس کتاب کو تحریر کر رہی ہیں۔

اس کتاب میں بناوٹی نمائش سے نئے نوجوانوں کو نکالنے کی ایک کاوش کی گئی ہے اور اُن کے اندر آزادی اور حقوق انسانی کے ارفع اصولوں سے آشنا کرنے کے ساتھ اُن کو مقامی ثقافت، رواج اور بودوباش سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ وہ خود کو اِن سے آزاد کر کے اُن طریقوں کو اپنائیں جو آج ہر شہری، مرد و زن کا حق ہے۔مصنفہ نے بہت کٹھن مراحل سے گزر کر ایک ایسا مقام حاصل کیا کہ اُسے عورت کو کمتر سمجھنے والے اس معاشرہ میں بلدیہ راولپنڈی میں نمائندگی ملی جو ایسے تنگ نظر معاشرہ میں ممکن نظر نہیں آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ان کی قلم میں وہ قوت بخشے کہ یہ حقیقی محبّ وطن کے طور پر شناخت حاصل کر سکے۔آمین

—— حمیداللہ

کچھ مصنفہ کے بارے میں

سمیرا گل کے والدین ستّر کی دہائی میں ایبٹ آباد کے پہاڑوں سے روزی روٹی کی تلاش میں راولپنڈی آئے۔ شہر کی مضافاتی آبادی میں پرورش پائی۔ وقارالنساء کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ بھائی نہ ہونے کی وجہ سے والدین کو سہارہ دینے کے لیے معاشی سرگرمیاں شروع کیں۔ مقامی فلاحی ادارے میں سماجی خدمات سرانجام دیں اور ایک غیر رسمی سکول کی معلّمہ بنی۔ سماجی سرگرمیوں کی بدولت ادارے کی سربراہ بنی اور سیاسی سرگرمیاں بھی شروع کیں اور شہر میں نمایاں مقام پایا۔

سماجی خدمات کے اعتراف میں امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین خود چل کر ان سے ملنے آئی اور ان کو امریکی دورے کی دعوت دی۔ یورپی سفیر کٹ جیول بھی ملاقات کے لیے آئے۔ صدر پاکستان نے انسانی حقوق کے ایوارڈ سے نوازا جبکہ UN نے شہری ماحولیاتی خدمات کے اعتراف میں ٹوگی (TUGI) ایوارڈ دیا۔ سماجی کاموں کو مزید بہتر طریقے سے کرنے کے لیے کئی غیر ملکی دورے کئے اور تربیتی پروگراموں میں شرکت کی۔ یہ کتاب مصنّفہ کی پہلی کاوش ہے۔

اظہار تشکر

میں اظہار تشکر میں سب سے پہلے شکریہ ادا کرتی ہوں حمید اللہ کا جنھوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یہ کام کرنے کا مجھے آئیڈیا دیا کہ مجھے اپنی روز کی ڈائری لکھنے اور سماجی خدمت کے ساتھ ساتھ کچھ تخلیقی کام بھی کرنا چاہیے یعنی کچھ تحریر کروں۔ انھوں نے نہ صرف مجھے آمادہ کیا بلکہ ان آبادیوں کے مکینوں کے بارے میں لکھنے کا مشورہ دیا جس کے بارے میں لوگ یہ بتانا بھی پسند نہیں کرتے کہ وہ ان علاقوں میں پیدا ہوئے ہیں یا ان میں رہ رہے ہیں۔ ان سے ہر لمحے مشاورت کے بعد میں اس قابل ہوئی کہ اپنے خیالات اور اصل واقعات کو الفاظ کی شکل دی جا سکی۔ پھر ان الفاظ کو تو میں نے کبھی دن کو دفتر میں، کبھی دھوپ میں، کبھی ہیٹر کے آگے بیٹھ کے کبھی رات کو اپنے ٹی وی لاؤنج میں آدھی رات تک کاغذ کے ٹکڑوں پر اتارا مگر انھیں کمپیوٹر میں ٹائپ کرنے کے لیے ایک محترم عارف صاحب کی خدمات لیں، جنھوں نے بڑی محنت سے پتہ نہیں کن کن اوقات میں اپنے گھر میں مسودہ ٹائپ کر کے اگلے دن ان کے پرنٹ آؤٹ لا کے دیتے رہے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ جب وہ کوئی مضمون ٹائپ کر کے لاتے تو مجھے بڑی سادہ پنجابی زبان میں پوچھتے ''میڈم تسی اینیاں گلاں کیڑے ویلے سوچ لیندے او، وقت مل جاندا اے'' تو میں انھیں کہتی عارف صاحب یہ سوچنے کی بات نہیں ہے بلکہ ہمارے وہ تجربات ہیں جو ہم نے خود کیے ہیں یا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ ہمارے ذہنوں کے ساتھ دل میں بھی نقش ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے نوجوان سٹاف اشتیاق، علی، اسد اللہ کا بھی شکریہ ادا کروں گی جنھوں نے سماجی خدمات اور اب ادبی کام میں میری معاونت کی جبکہ اُن کی عمر کے بچے ان کاموں سے دور بھاگتے ہیں اور کھیل کود اور آوارہ گردی کو اپنا مشغلہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اِن کی دلجمعی سے مجھے بھی حوصلہ ملتا رہا۔ میں استادِ اعظم جناب عارف حسن صاحب، جناب فیاض باقر صاحب اور جناب غلام محمد ناز صاحب کی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف کتاب پر اپنے ریمارکس دیے بلکہ اس پر نظر ثانی بھی کی اور میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

اس کے بعد اس کتاب کو چھپوانے کا مرحلہ آیا جس میں محمود فیصل راجہ صاحب، کتاب ساز پبلی کیشنز

جنھوں نے اسے نہ صرف چھاپا بلکہ اس میں نظر ثانی بھی کی۔اس کے ٹائیٹل کے لیے تصویر نیوز اخبار کے فوٹو گرافر راجہ خالد صاحب نے خصوصی تصویر بنائی۔ان کا شکریہ۔اس کے علاوہ شہزاد احمد فیاض صاحب نے ٹائیٹل ڈیزائن کیا اور جب یہ تیار ہوگئی بلکہ چھپنے سے قبل ڈاکٹر نگینہ صاحبہ نے وزیر اطلاعات ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان صاحبہ سے رونمائی کی تقریب کے لیے وقت لینے میں مدد کی اور فردوس عاشق اعوان صاحبہ کا شکریہ خصوصی طور پر کہ جن کی وجہ سے یہ کتاب لائبریری کی زینت بن چکی ہے۔

—سمیرا گل

بچے کی پیدائش کے بعد کے رسم ورواج

ترقی یافتہ اقوام میں یا ہمارے مراعات یافتہ طبقے میں پہلے ہی تمام چیزیں طے کر لی جاتی ہیں کہ بچے کا ڈاکٹر کون ہوگا؟ نام کیا ہوگا؟ پیدائش نارمل کرنی ہے یا آپریشن کے ذریعے۔ اگر آپریشن ہوگا تو ہسپتال کون سا ہوگا؟ اور کس سرجن سے آپریشن کروانا ہے۔ پہلے بچے کو کون دیکھے گا اور بعد میں کون۔ بچے کا ستارہ کیا ہوگا، نام کیا ہوگا؟ الغرض پوری منصوبہ بندی کے ساتھ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن ہماری غریب آبادیوں میں عام طور پر بچہ گھر پر ہی کسی دائی کے ہاتھوں میں پیدا ہوتا ہے جس کی تعلیم کبھی کسی نے نہیں پوچھی۔ نہ اس کو ملنے والی تربیت کا ہمیں علم ہوتا ہے بس اتنا بتایا جاتا ہے کہ دائی منور اور دائی کریما میں دائی منور زیادہ سینئر اور تجربہ کار ہے اور میرا افلاس بھائی، دیور اس کے ہاتھوں میں پیدا ہوا تھا۔

دائی صاحبہ کو عین درد زہ میں بلانے کے لیے گھر کا سربراہ یا کوئی خاتون جاتی ہے وہ جلدی سے شاپر میں بہت سی قسم کے ٹیکے اور سرنج ڈال کے پاؤں گھسیٹتی ہوئی آتی ہے اس گھر میں جہاں بیس، پچیس سال قبل کوئی بچہ اس نے پیدا کرنے میں ٹیکنیکل مدد فراہم کی ہوتی ہے انھی کی دوسری نسل کی آمد پر فخر سے اس بچے کا نام اور مہینہ بتاتی ہے کہ میں نے اسی طرح پہلے بھی کیس کیا تھا۔ ہر دس، پندرہ ہزار کی آبادی میں دو، چار دائیاں اس طرح کی ہوتی ہیں جن میں سے اکثر بوڑھی ہو کر یا مر چکی ہیں یا مرنے کے قریب ہیں اور اپنا ورثہ اپنی کسی بہو بیٹی یا محلے کی خاتون کو منتقل کر چکی ہیں۔

جب دائی صاحبہ گھر میں داخل ہوتی ہے یا تو بچہ دنیا میں آ چکا ہوتا ہے یا پھر قریب ہوتا ہے۔ کبھی انجکشن لگانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ کبھی تو اس بے چاری کا دوسرا یا تیسرا چکر

ہوتا ہے اور وہ اگلی تاریخ دے کر چلی جاتی ہے۔

اب جب بچہ دنیا میں آ گیا تو نومولود کو وارثوں کو دے دیا جاتا ہے جو اسے خود ہی نہلا لیتی ہیں جبکہ گھر والوں کو مشورہ دے کر ہی کام چلاتی ہیں۔ پھر اس بچے کو عموماً پرانے کپڑے جو اس کے بڑے بھائی، کزن یا کسی کی طرف سے ایک ماہ قبل ہی گفٹ کیے گئے ہوتے ہیں، پہنائے جاتے ہیں۔ اکثر نئی لڑکیاں گھر والوں سے چوری فراک یا کُرتے شوق سے سی لیتی ہیں اور ان کی خواہش پہنانے کی ہوتی ہے مگر گھر والوں کے ڈر سے وہ پوری نہیں کر سکتی کہ بچے کے لیے چالیس دن پرانے کپڑے ہی ٹھیک ہیں جس کی ایک وجہ تو نیا کپڑا سخت اور کھردرا ہوتا ہے دوسرا اس کی خاصیت کا علم نہیں ہوتا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بچے کو نظر نہ لگے اور جیب پہ بھی اثر نہ پڑے۔

عام طور پر نومولود کو صرف ایک قمیض اور سردیاں ہوں تو گرم سویٹر وغیرہ پہنا کے نیچے سے تین کونوں والا لنگوٹ باندھ دیا جاتا ہے جو آج کل پمپر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑے سے موٹے یا پتلے کپڑے میں موسم کی مناسبت سے لپیٹ دیا جاتا ہے بعض اقدام میں ایک رسی سے کس کر باندھ دیتے ہیں تاکہ وہ بڑا ہو کر سختیوں کا عادی ہو سکے اور مضبوط اعصاب کا مالک بنے اس کی قوت برداشت زیادہ ہو جائے۔ سر پر ٹوپی اور رومال یا چوڑے کپڑے کی پٹی سی بھی باندھتے ہیں تاکہ اس کا ماتھا ٹرک کی طرح باہر نہ نکل آئے بلکہ چوڑے ماتھے والا خوش نصیب بچہ ہو۔

سر کے نیچے گول سا تکیہ جس میں اکثر لوگ چاول، ریت یا گندم کے دانے ڈال کے بناتے ہیں وہ رکھ دیا جاتا ہے کہیں کہیں بچپن میں بچوں کے سر کے نیچے پلیٹ بھی اُلٹی کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ سر کو گول کرنے کے لیے رکھی گئی ہے۔ اب ماڈرن دور ہے جنرل سٹور سے دس، بیس روپے کا تیار ایک کپڑے کا گول تکیہ بنا ہوا مل

جاتا ہے جس میں گتہ لگا ہوا ہوتا ہے وہ خریدا جاتا ہے میں نے بھی اپنے بیٹے اور بیٹی کے سر کے نیچے وہ تکیہ رکھا تھا جبکہ امی تو پلیٹ رکھنے کا کہہ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ سر کو گول کرنے کے لیے بچے کو صرف سیدھا نہیں لٹاتے بلکہ کروٹ بدل بدل کر ڈالا جاتا ہے۔

پہلے دن نہلانے کے بعد سرسوں کے تیل کی مالش لازمی کی جاتی ہے اور دو سے پانچ سال تک یہ سلسلہ چلتا ہے بلکہ سرسوں کا تیل تو بچے کی ہر بیماری کے علاج میں کئی سال تک استعمال ہوتا ہے۔ میں بھی ایسا کرتی رہی۔ بچہ روئے تو فوراً اس کے پیٹ پہ تیل لگا دیا جاتا ہے۔ پھر روئے تو اس کے کان میں تیل ڈال کے چیک کیا جاتا ہے پھر بھی روئے تو سرسوں کے تیل میں لہسن گرم کر کے بچے کی ناف پہ لگا دیا جاتا ہے جو دائی کاٹ کے گئی ہوتی ہے کہ شاید اس میں درد نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کی ناف پر کپڑا ابھی جلا کے لگاتے ہیں۔ یہ سب میں نے خود ان غریب آبادیوں میں عورتوں کو کرتے دیکھا ہے۔

اب بچے کی آنکھوں کی باری ہوتی ہے۔ سرمہ تو پیدائش سے قبل نانی دادی، تائی چاچی لا کے رکھتی ہیں۔ ان میں سے تجربہ کار خاتون بچے کی آنکھوں میں سرمہ ڈال کے ماتھے پر ٹکہ لگا کے سجا دیتی ہے۔ اب بچہ بالکل تیار ہوتا ہے لوگ اسے دیکھنے آنے لگتے ہیں اور خاندان کے یا محلے والوں کو جو خاتون یا فرد خوشخبری دیتا ہے اُسے کوئی نہ کوئی تحفہ یا نقد رقم بھی دی جاتی ہے جسے ہم سرپرائز یا زیرہ بھی بولتے ہیں۔ پشتو زبان میں محلے والے اور خاندان والے آنے کے بعد پہلا سوال کرتے ہیں اسے گھٹی کس نے ڈالی۔ عموماً اس بات پہ جھگڑا ہوتا ہے کہ گھٹی کس سے ڈلوائی جائے گی اور اذان کون دے گا۔ اذان تو کسی بھی معتبر بزرگ یا گھر میں موجود مرد سے دلوائی جاتی ہے مگر گھٹی ایک مسلسل سر درد ہے وہ اس طرح کہ بچہ جب بڑا ہو کر کوئی غلط حرکت یا ڈھیلا پن، پھرتی دکھائے تو اس کو اس بندے کا نام لے کر گالی دی جاتی ہے کہ اس پر اس گھٹی ڈالنے والے کا اثر ہے۔ اس لیے اس پہ سوچ سمجھ کے

فیصلہ کیا جاتا ہے کہ بچے کو کس سے گھٹی ڈلوائی جائے۔کبھی کبھی تو یہ مسئلہ دائی صاحبہ اپنے پلو کے ساتھ باندھی ہوئی چینی بچے کے منہ میں ڈال کے حل کر دیتی ہیں یا نانی دادی خود ہی دیسی گھی میں چینی،گڑ ڈال کے اسے گرم کر کے کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی نما گھٹی جو نپل کی طرح ہوتی ہے بچے کو چٹا دیتی ہیں۔قہوہ بھی چمچ سے گھٹی کے طور پلایا جاتا ہے۔آج کل دواخانے والوں نے ریڈی میڈ بوتل میں بھی گھٹی بیچنی شروع کر دی ہے جسے ڈاکٹر تو اجازت نہیں دیتے مگر ہماری آبادیوں میں بہت استعمال ہو رہی ہے۔

سب کام مکمل کرنے کے بعد مشورہ دیا جاتا ہے کہ بچے کو چودہ دن تک صرف گھوٹی یا قہوہ ہی دینا ہے ماں کا دودھ تیسرے دن دُعا کر کے دیں گے مگر حالات اور میڈیا میں آنے والی معلومات سے لوگوں پر واضح ہو گیا ہے کہ چند گھنٹے بعد ماں کو ہوش سنبھالنے کے بعد دودھ پلانے کی اجازت دے دی جاتی ہے مگر لڑکی کے رشتے داروں کو اس کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے وہ تھوڑی دیر بچے کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ماں کے دودھ کو ہمیشہ گرم پانی سے دھوئیں۔خواتین بزرگ رہنماؤں کی مدد سے کیل نکلواتے ہیں۔بوتل کا رواج عام نہیں ہے مگر کبھی کسی جگہ یہ چند دن بعد بوتل کی ضرورت پڑ جاتی ہے مگر شکر ہے ڈبے کا دودھ مہنگا ہے تو بچے کو بوتل پلانے سے منع کیا جاتا ہے۔ماں کا دودھ مفت ہونے کی وجہ سے ہمارے علاقوں میں اس کو پلانے کا رواج ہے۔

اب سب گھر والوں میں بحث ہوتی ہے کہ بچے کا نام کیا رکھا جائے عام طور پر پہلے بچے کی دفعہ ننیال اور ددھیال والوں میں لڑائی بھی ہو جاتی ہے کئی نام ہوتے ہیں بچہ اگر دوسرا یا تیسرا ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ پچھلے بچوں میں تناسب کیا ہے۔خالہ نے کس کا نام رکھا ہے اور پھوپھی نے کتنے بچوں کا۔ پھر مجبوری میں فیصلہ نہ ہونے کی صورت میں اکثر ماں باپ بچے کے تین تین نام رکھ دیتے ہیں۔ چاچا اور نام لیتے ہیں،خالائیں اور نام لیتے

ہیں اور ماں باپ دونوں کی ناراضگی سے بچنے کے لیے عرف عام گڈو، پپو، مانی، شانی، مانو، گڑیا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ کاغذوں میں یا رجسٹریشن میں درج نام سکول جانے کے بعد بچے کو پتا چلتا ہے۔

پیدائش کے ایک ہفتے بعد اکثر نارمل کیسز میں خاتون کو اُٹھ کے کام کاج پہ لگنا پڑتا ہے صدقے کے طور جس کے لیے گھر میں موجود بڑی خواتین کالے چنے منگوا کے دعا کر کے محلے میں بانٹتی ہیں۔ پھر اکثر گھروں میں حلوہ، چاول وغیرہ بھی بنا کے محلے والوں کو بھیجے جاتے ہیں اور نومولود کی ماں کو کہا جاتا ہے کہ وہ سب کے لیے چائے وغیرہ بنائے۔ اگر آپریشن کے ساتھ پیدائش ہو تو پھر یہ سب کچھ ڈاکٹر کے مشورے یا ٹانکے کھلنے کے بعد کیا جاتا ہے۔

اب بچے کے سر کے بال تیسرے یا ساتویں دن منڈوائے جاتے ہیں۔ لڑکی ہو یا لڑکا گھر میں ہی حجام بلا کے یہ مرحلہ طے کیا جاتا ہے جس کے لیے حجام صاحب کو مٹھائی کا ڈبہ اور سو، دوسو روپے دینے پڑتے ہیں۔ عموماً پہلے بچے کی پیدائش پر اس کے بال رومال میں باندھ کے سنبھال لیے جاتے ہیں جو خوش قسمتی کے لیے گھر میں صندوق میں سنبھال کے رکھے جاتے ہیں۔ میری والدہ نے میرے بیٹے کے بال اپنے گھر میں اتروائے تھے اور اپنے پاس صندوق میں رکھے ہیں جس میں اپنی پہلی بیٹی (میری بہن) کے رکھے تھے۔

عام طور پر بچے کی رجسٹریشن نہیں کروائی جاتی ہے بلکہ ایک فارم جو میونسپلٹی میں رجسٹریشن والوں کے پاس سے ملتا تھا اس میں چھ عدد بچے ترتیب وار لکھ کرا سے گھر میں رکھا جاتا تھا اور اس کی کاپی میونسپل کارپوریشن میں دائی درج کرواتی تھی۔ بہت نصیب والے بچوں کی آج سے پچیس تیس سال قبل رجسٹریشن ہوتی تھی مگر آج کل یہ کام لوکل باڈیز سسٹم نے آسان کر دیا ہے اس میں علاقے کی یونین کونسل کے دفتر سے ایک عدد فارم بیس روپے

میں ملتا ہے جسے پر کر کے باپ یا ماں کی شناختی کارڈ کی کاپی لگوا کے دستخط کرا کے جمع کروا دیں تو ہفتے بعد برتھ سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔

اب نادرا میں جو شناختی کارڈ بنتے ہیں وہ بھی رجسٹریشن فارم (ب) بنا کے دیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں بہت کم فوری طور پر ب فارم نادرہ سے کوئی بنواتا ہے بلکہ جب بھی بچہ سکول جانے کے قابل ہوتا ہے تو بنوایا جاتا ہے۔عام طور پر یہ تکلیف بھی سرکاری سکول میں داخلے کے وقت کی جاتی ہے۔

آج سے کئی سال قبل ہمارے ان علاقوں میں حفاظتی ٹیکے لگانے کے لیے دو تین یونین کونسلز کے اندر کسی مرکزی جگہ پر ایک گورنمنٹ کی ڈسپنسری ہوتی تھی اس میں مہینے کی آخری یا شروع کی تاریخوں میں حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے تھے وہ بھی بچوں کے جسم پر جوانی تک نشان چھوڑتے تھے مگر آج کل ڈسپنسری کی سہولت نہیں البتہ محکمہ صحت کی طرف سے باقاعدہ پولیو کے قطرے اور حفاظتی ٹیکے لگانے والے اہلکار گلی محلوں میں گھروں میں آ کر ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔لوگوں کو بھی شعور آ گیا ہے وہ شہر کے میں موجود ہسپتال سے یہ ٹیکے لگوانے لگے ہیں جبکہ اب حکومت کی طرف سے کار خیر سال میں دو دفعہ کیا جاتا ہے جس میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔

بے چاری لڑکیوں کو ماں باپ پر بوجھ سمجھا جاتا ہے حالانکہ ان کی پیدائش پر محلے میں نہ مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے، نہ ہی دائیاں سوٹ وغیرہ مانگتی ہیں۔نہ ہی ان کی خوشی پہ گانے بجانے والی آتی ہیں۔جبکہ لڑکے کی پیدائش پہ ان سب مسئلوں پر اخراجات خاندان والوں کو اٹھانے پڑتے ہیں۔ہیجڑے، گانے بجانے والی نٹنیاں، ودھائی لینے آنا شروع ہو جاتی ہیں سب عزیز و اقارب اور محلے دار مٹھائی مانگتے ہیں اور سب سے بڑا خرچہ تو لڑکے کے ختنے جسے سنتیں یا مسلمانی بٹھانا بھی کہتے ہیں یہ ہوتا ہے بہت کم باشعور لوگ اس کی پیدائش کے

ہفتے بعد ختنے کروا لیتے ہیں۔ زیادہ تر اس کی پلاننگ پہ ایک سال لگا دیا جاتا ہے کہ فلاں چاچا یا ماموں کی شادی منگنی پہ اکٹھی خوشی کریں گے۔اگر کوئی متوقع موقع نہ ہوتو پھر باقاعدہ سے شادی کی طرح دو، چار دن کا فنکشن پلان کر کے یہ نمٹایا جاتا ہے اور پہلے نائی حجام پر ذمہ داری ادا کرتے تھے اب یہ کام ڈاکٹر بلکہ عطائیوں نے شروع کیا ہے جس کی فیس پانچ سو سے دو ہزار روپے تک لیتے ہیں اور باقاعدہ سونے کی انگوٹھیاں جوڑے تحائف نقد روپے کا سلسلہ پیدائش سے سنت تک چلتا ہے۔ جو ادھار ہوتا ہے آپ نے جتنا کسی کو دیا ہے اس کا دگنا ملتا ہے اور پھر دوگنا دینا پڑے گا۔ان فضول رسومات کی وجہ سے لڑکے کے والدین کو بھی بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور ناک اونچی رکھنے کے لیے قرض بھی لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے بے شمار مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔

ذرائع آمدورفت اور ذریعۂ معاش

امیر گھرانوں میں لش پش کرتی کئی گاڑیاں گھروں میں موجود ہوتی ہیں۔ ٹیوٹا، ہنڈا، بی ایم ڈبلیو اور فیشن کے لیے فوکسی یا ویلی جیپ، اس کے علاوہ دفتر کی طرف سے بھی گاڑیاں زیر استعمال میں رہتی ہیں۔ صاحب کے لیے علیحدہ گاڑی بیگم صاحبہ کے لیے علیحدہ، بچوں کو سکول لانے لے جانے کے لیے علیحدہ اور دادا، دادی یا نانا، نانی کے لیے الگ گاڑی ہوتی ہے۔

لیکن غریب آبادیوں میں لوگ کہیں آنے جانے کے لیے بچے، نوجوان اور بوڑھے عام طور سائیکل اور موٹر سائیکل استعمال کرتے ہیں۔ عموماً گلیاں تنگ ہونے کی وجہ سے گاڑیاں رکھنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔ اکثر غریب افراد کا ذریعۂ معاش ہی ڈرائیوری ہوتا ہے ان کے پاس عام طور پر ذاتی، کرائے یا اقساط پر ٹیکسی ہوتی ہے مگر وہ ٹیکسی کو اپنے گھر کے اندر تو دور کی بات گھر کے قریب بھی کھڑی نہیں کر سکتے۔ بہت کم گلیاں بیس تیس فٹ کی ہوتی ہیں۔ زیادہ تر ان آبادیوں کے چاروں اطراف بڑے پلاٹس مارکیٹ یا کھیتوں کو چار دیواری کر کے گیراج بنائے گئے ہیں جہاں پر دس یا بیس روپے روزانہ کے دے کر گاڑی کھڑی کرنے کی سہولت ہوتی ہے مگر نہ تو وہاں پر بارش سے بچنے کا کوئی انتظام ہوتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی سیکورٹی کا انتظام۔ گاڑی چوری ہونے کی صورت میں بھی آپ ان سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ آپ اپنی ذمہ داری یا نصیب پر یقین رکھتے ہوئے گاڑی کھڑی کر سکتے ہیں۔ اکثر اوقات ان گیراجوں میں دوسری ماسٹر چابی لگا کے گاڑی سیکھنے کے شوقین افراد گیراج کے مالک کو بتا کے سو پچاس روپے دے کر گاڑی قریب کے

میدان یا بڑی گلی میں چلانے کی پریکٹس کرتے ہیں جس کی گاڑی کے مالک کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی بلکہ ایسا کرنے والے عموماً گیراج والے کے عزیز ہوتے ہیں۔ گھر کے بچے بھی جنہیں کم عمری کی وجہ سے باقاعدہ طور پر گھر والوں سے گاڑی چلانے کی اجازت نہیں ملتی وہ بھی گھر سے چابی چرا کے ایسی حرکات کر لیتے ہیں جس کی چوری اکثر پکڑی جاتی ہے اسے ڈانٹ یا مار کھانا پڑتی ہے۔ اب تک جب میں اپنی والدہ کے ساتھ بازار سبزی وغیرہ لینے جاتی تھی تو گھوڑا تانگہ ہوتا تھا جو پانچ سات روپے میں کئی آبادیوں سے ہوتے ہوئے بازار پہنچا دیتا تھا مگر نو سال قبل راولپنڈی تحصیل اسمبلی میں بھینسوں کو شہر سے باہر نکالنے کی قرارداد پیش کی گئی جس پر عمل درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ ناظم تحصیل نے تانگوں کو بھی شہر سے ختم کرنے کا حکم جاری کر دیا اور کئی غریب نہ صرف اچھی بھلی سواری سے محروم ہو گئے بلکہ روزگار سے بھی فوری طور پر محروم ہو گئے۔

پھر اللہ بھلا کرے چائنا کا۔ جس نے چنگ چی ایجاد کر کے ہمارے ملک میں بھیج دی اور جس نے فوراً تانگہ کی جگہ لے لی۔ ہمارے علاقوں میں عام طور پر سوزوکیاں بھی لوکل چلتی ہیں اس میں لوگ آرام سے سفر کر لیتے ہیں روڈ پکے اور کھلے ہونے کی وجہ سے اب تو کئی ویگنیں بھی روٹ بدل کے ان آبادیوں میں اکثر چلتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر ان میں جگہ بہت کم ہوتی ہے۔ اکثر پہلے سٹاپ سے ہی بھری ہوئی آتی ہیں اور پھر اکیلی خواتین کو تو بٹھاتے بھی نہیں ہیں۔ ڈبل سواری کا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ البتہ آٹو رکشہ اب سی این جی میں تبدیل ہو گیا ہے وہ سستی سواری ہے۔ زیادہ تر خواتین دو، تین ہو کر سفر کرتی ہیں تو وہ چنگ چی میں 45 روپے ادا کرنے کی بجائے پچاس ساٹھ روپے میں رکشہ لے لیتی ہیں۔ رکشہ چھوٹی گلیوں کے اندر بھی جا سکتا ہے اور خواتین کے لیے محفوظ سواری سمجھی جاتی ہے۔

ٹیکسی نسبتاً مہنگی سواری ہے عموماً جب کوئی دوسرے شہروں سے مہمان یا نئے نئے

لوگ آتے ہیں تو انجانے میں ٹیکسی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ بہت صبح اور بہت رات کو جب روٹ کی یا لوکل گاڑیاں نہ چلیں یا مری روڈ، راول روڈ اور اسلام آباد، کینٹ، مال روڈ پر چنگ جی وغیرہ اور رکشہ کو اجازت نہیں ہوتی تو پھر مجبوراً ٹیکسی پر سوار ہونا پڑتا ہے۔ البتہ کسی کی نئی نئی شادی ہوئی ہو یا کوئی خفیہ گرل فرینڈ کو نقاب یا برقع اوڑھائے گھمانے پھرانے کے لیے لے جانا چاہتا ہو تو وہ بھی رعب کے لیے یا چُھپنے کے لیے ٹیکسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کے پاس گھوڑا یا گدھا گاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ آنے جانے کے علاوہ فروٹ اور سبزی وغیرہ قریبی منڈی سے لانے کے لیے گدھا گاڑی یا گھوڑا گاڑی کا عموماً استعمال ہوتا ہے۔ بچے کچے پھل یا سبزیاں گدھے اور گھوڑے کی خوراک بن جاتے ہیں۔ چھوٹی دوکانوں پر سامان لانے کے لیے بھی سواری کے ان ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اس ترقی کے دور میں بھی انسان سامان لے کر جانے کے لیے ریڑھا استعمال کرتے ہیں جس کو وہ خود کھینچتا ہے۔

ان علاقوں کے بہت سے لوگ غربت افلاس سے تنگ آ کر بھٹو دور میں بہت تیزی سے عرب اور دوسرے ممالک میں گئے اور کافی زرمبادلہ ملک میں آنے لگا تو ان علاقوں کے چھوٹے گھروں میں بھی ٹی وی، فریج، واشنگ مشینوں کے ساتھ ساتھ اچھے اچھے کپڑے اور زیور بھی آنے لگے جبکہ اس زرمبادلہ کی وجہ سے اچھے اچھے ماڈرن گھروں کی تعمیر بھی ہوئی ہے۔ ہر خاندان سے ایک ایک شخص روزی کمانے دیارِ غیر گیا۔ اس کے علاوہ ہمارے ان علاقوں میں روزی کمانے کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے۔ ٹرکوں کے احاطے ہیں۔ ٹرکوں ٹھیک کرنے کے لیے بڑے احاطے بنے ہوئے ہیں جن میں مکینک گاڑیوں کو ٹھیک کرنے کے ساتھ ان پہ خطاطی کا کام بھی کرتے ہیں جسے آج کل عرف عام میں ٹرک آرٹ کہتے ہیں۔ صرف راولپنڈی شہر کے انھی چھوٹے چھوٹے علاقوں میں اتنا بڑا کام ہوتا ہے

جس کو کرنے والے آرٹسٹ بالکل اَن پڑھ ہوتے ہیں جو سکولوں مدرسوں سے بھاگنے والے لڑکے ہوتے ہیں اور مکینک بھی انھیں شاگردی میں نہیں لیتے وہ اس پیشے سے منسلک ہوجاتے ہیں اور اردو بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے مگر ان کے ہاتھوں کی انگلیاں کیا خوبصورت نقش ونگار، تصاویر تحریر کرتی ہیں کہ کوئی پی ایچ ڈی یا ماسٹر ڈگری والا بھی نہیں کرسکتا بلکہ اس فن کا تو آج کل بیرون ملک خصوصاً یورپ میں بہت مانگ ہے۔ انگریز بھی ان احاطوں میں پھرتے رہتے ہیں اور ٹرکوں کی تصاویر بناتے رہتے ہیں۔ بعض گورے ان ٹرک کے آرٹسٹوں سے مختلف چیزیں بھاری معاوضے پر بنواتے ہیں۔ ۹/۱۱ کے بعد اب ان گوروں نے آنا کم کردیا ہے بلکہ اپنے نمائندوں کے ذریعے ان آرٹسٹوں سے کام کرواتے ہیں اور بعض پاکستانی ان گوروں سے راہ و رسم بنانے کے لیے اشیا دیتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سٹین لسل سٹیل کی چادروں پر بھی کاریگری کی جاتی ہے جس کو ٹرکوں اور بسوں کی خوبصورتی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان احاطوں کی وجہ سے کافی بچوں کو گھر کے قریب روزگار ملتا ہے اور وہ رزق حلال کمانے کے قابل ہوجاتے ہیں۔

ذریعۂ معاش

سرمایہ دار، جاگیردار اور مڈل کلاس لوگ روزی روٹی کے چکر سے آزاد ہوتے ہیں، وہ نام کے لیے کام کررہے ہوتے ہیں۔ بینک میں ڈیپازٹ موجود ہوتے ہیں جہاں سے معقول آمدنی ہوتی ہے۔ بچوں کی پیدائش کی طرح ان کی نوکریاں یا کاروبار بھی منصوبے کے تحت ہوتے ہیں۔ بچے جونہی یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہیں، ان کے لیے بیرون ممالک میں پڑھائی، انٹرن شپ، نوکری یا کاروبار حاضر ہوتا ہے۔

لیکن غریب آبادیوں میں ذریعہ معاش میں زیادہ تر لوگ روزانہ کی اجرت پہ کہیں نہ کہیں مزدوری کرتے ہیں جس میں ڈرائیوری، ترکھان، مستری (ویلڈنگ مکینک) ، بازاروں میں مستری یا فروٹ اٹھانے اور بیچنے والے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے موٹے دوکاندار یا بزنس مین بھی کہہ سکتے ہیں۔ بازاروں میں زیادہ تر چھابہ لگاتے ہیں۔ بچوں کے کپڑے، جوتے، سبزی، سوئیاں، دھاگے، پرانے کپڑے، جوتے لنڈے بازار میں بھی سٹال لگا کر بیچ لیتے ہیں۔ خاص طور پر ریڑھیاں لگائے ہوئے فروٹ اور سبزی والے سب کے سب ان ہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ بھلے وہ کسی پوش ایریا میں یا مرکزی بازار میں جا کر فروخت کریں واپس ان ہی گلی محلوں میں آ کر رہتے ہیں۔ ان علاقوں کے اندر بھی چھوٹے موٹے کاروبار ہورہے ہیں یہ دوکانیں اب مارکیٹ میں تبدیل ہورہی ہیں خواتین کی آرائش وزیبائش، کپڑے جوتے، برتن، گوشت، پھل سبزیاں، کریانہ، زرگر، بیوٹی پارلر، بیکری، تندور اور چیزوں کو سجا کے فروخت کیا جارہا ہے۔ ان کی قیمتیں زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی دوکانوں کے کرائے، بلز سیلز مینوں کی تنخواہیں اور اپنا منافع سب

انہی گاہکوں سے نکالنا ہے۔ چاہیے انھیں قسمیں کھا کے دونمبر چیزیں دوگنے داموں ہی کیوں نہ بیچنی پڑیں۔ یہ سب کرنا پڑتا ہے۔

کبھی کبھی ان علاقوں میں آبادی کم ہونے کی وجہ سے بہت سے کھلے کھیت اور میدان ہوا کرتے تھے جہاں پودینہ، ساگ، مولیاں اور دیگر سبزیاں کاشت کی جاتی تھیں جو یہاں پہ سستے داموں ملا کرتی تھیں مگر اب یہ ذریعہ معاش صرف چند علاقوں میں موجود چند کھیتوں پر رہ گیا ہے۔ بڑی بڑی برادریوں کے پورے پورے علاقے ہوا کرتے تھے جس پہ ان کے گھر چلا کرتے تھے۔ اب انھوں نے بھی سبزیاں کاشت کر کے پیسے کمانے کی بجائے ان کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے، دو تین کمروں کا گھر بنا کر بہت سی تعداد میں اوپر نیچے کرایہ پر چڑھا دیے ہیں جو ان کے لیے آمدن کا ذریعہ بن گئے ہیں کیونکہ بازار قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ گاؤں سے شہروں کی طرف مزدوری پہ آنے والے افراد یہاں پر کرایہ پر گھر حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے اچھے کاروبار اور ذریعۂ معاش کے ساتھ ساتھ ان علاقوں کے مکینوں میں ایک ذریعہ معاش نشہ آور چیزوں کی فروخت کا بھی ہے جو ضیاالحق کے دور میں افغانستان جنگ کے صلے میں بہت سے افغانیوں کے ساتھ ساتھ افیون (پوست) کی کاشت اور ہیروئن بننے کی وجہ سے پاکستان درآمد ہونے لگی۔ چرس یا (گانجہ) پہلے سے یہاں عام تھا۔ شراب بھی دیسی نسل کی بڑے آرام سے ملتی تھی یہ سب کاروبار 1980ء کی دہائی کے آغاز سے اختتام تک یہاں پہ پچیس فیصد لوگوں کا ذریعہ معاش رہا اور دو نسلیں ایک جو اس وقت جوان تھے اور دوسرے جو بچے تھے اور جوان ہو گئے۔ اس کاروبار سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ نشے میں بھی مبتلا ہونے لگے۔ آج کل یہ کاروبار بھی چل رہا ہے مگر اس طرح کھلے عام نہیں جس طرح میرے بچپن میں تھا میری پڑوسن کی بچی اپنی امی یا ابا کے لیے چرس کے بڑے بڑے ٹکڑے جو ہم چاکلیٹ سمجھا کرتے تھے دروازے پر

کھڑے گاہک کو دے دیتی تھی جو عموماً چار پائی کے اوپر بچھے ہوئے بستر کے نیچے رکھے ہوتے تھے۔ جو یہ کاروبار کرتے تھے یہ سب لوگ سب مفرور ہو گئے یا مر گئے ہیں اور ان کے بچوں نے ان کی بیویوں کی تربیت کی وجہ سے مزدوری کرنے کو اپنا لیا ہے۔ اب کئی کھڑپینچ قسم کے لوگ جوالحاج ہونے کے ساتھ علاقے میں منصف بنے بیٹھے ہیں نہ صرف لوکل باڈیز بلکہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے بھی امیدوار ہوتے ہیں وہ اس پیشے سے منسلک ہو گئے ہیں۔ باقاعدہ ان کی حویلیوں میں شراب اور ہیروئن بکنے لگی ہے اس کے علاوہ جوّا بھی اکثر ان آبادیوں میں انہی کے گھروں، ڈیروں یا مقرر کردہ بیٹھکوں میں پولیس کی زیرنگرانی کاروبار بن چکا ہے۔

پہلے کچھ دھندا کرنے والی خواتین بھی ان علاقوں میں نالوں کے کنارے گھروں میں رہتی تھیں وہ ختم ہو گئی ہیں۔ ان کی اولادوں نے چھوٹے موٹے کام شروع کر لیے۔ میں نے اپنی جوانی میں کوئی ایسی خاتون یا گھر ان علاقوں میں نہیں دیکھا کچھ کی شادیاں ہو گئیں ان ہی محلوں میں رہنے والے دلالوں کے ساتھ کچھ نے شادی کر لی اور کچھ قتل ہو گئیں۔ باقیوں نے حج کر کے اپنا علاقہ بدل لیا۔ مگر ایک قسم کی خواتین جن کا پیشہ یا ذریعہ معاش ناچ گانا تھا جنھیں یہ لوگ کنجریاں یا نٹنیاں کہتے تھے وہ میرے کالج جانے تک بلکہ میری شادی اور بچے کی پیدائش تک کام کرتی رہیں وہ زیادہ تر قریبی قصبوں سے ہجرت کر کے ان علاقوں میں آئی تھیں اور پوری پوری گلی محلے ان کے نام سے منسوب کر دیے گئے تھے جہاں وہ رہتی تھیں اور اپنا رزق لوگوں کو ناچ گانا دکھا کر کما رہی تھیں اب وہ بھی ناپید ہو گئی ہیں۔ ان کی نئی نسل نے شعور آنے کے بعد تعلیم تو نہ حاصل کی۔ مگر اس پیشے کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھر بسا لیے۔ دوسرے قبول کرنے والے لوگوں کے ساتھ بھلے دوسری یا تیسری بیوی بننا قبول کر کے سہارے لے لیا۔

اکثر لوگوں کا ذریعہ معاش قریب کی فلور، کپڑے، دل کی ملیں ہیں جس میں ان علاقوں کے لوگ مزدوری کرتے ہیں، کچھ اندر اور کچھ باہر ریڑھیوں پر سامان لاد کر گلی محلے کی دوکانوں پر لاتے ہیں۔ ہر گلی میں ایک چھوٹی کریانہ کی بھی دوکان ہے جس پر مٹی کے تیل سے لے کر منیاری تک تمام چیزیں بازار سے دوگنا دام میں ملتی ہیں جو خاص بات یہ ہے کہ یہ کاروبار ہر اس بندے نے شروع کر رکھا ہے جو کسی قسم کا ہنر یا علم نہیں رکھتا، نہ اسے نوکری ملتی ہے اور بڑے کاروبار کے لیے وسائل دستیاب نہیں ہوتے تو عموماً بچوں کے پاپڑ اور ٹافیاں ببل وغیرہ کے چند ڈبے لے کر گھر کی بیٹھک جس کا دروازہ گلی میں کھلتا ہے کاروبار شروع کر دیا جاتا ہے۔ اگر گلی بند اور چھوٹی ہو تو پھر یہ محض چھوٹی دوکان بچوں کے لیے ہی چلاتے ہیں مگر اگر مین گلی جس میں کئی دوسری گلیاں آ کر ملتی ہوں تو آہستہ آہستہ اسی دوکان میں شیلف اور بڑی بڑی الماریاں لگ جاتی ہیں اور جنرل سٹور بن جاتا ہے جس سے پہلے وہ بندہ خود چلاتا ہے پھر اس کا بیٹا اور پوتا آگے بڑھاتا ہے۔ اکثر خواتین بھی جو بیوہ ہو جاتی ہیں یا کسی دوسری معاشی مجبوری کی وجہ سے گھر سے باہر جا کر کام نہیں کر سکتی ہیں پہلے گھر میں بالٹی میں دودھ رکھ کے بیچنا شروع کرتی ہیں پھر آہستہ آہستہ صحن سے بیٹھک میں دوکان بنا لیتی ہیں اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ دیگر دوکان دار اور محلے دار اس کی دوکان کو چلانے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

2003ء تک ان علاقوں میں نالوں اور خصوصاً لئی کے ساتھ ساتھ محلوں میں عام طور پر ہزارہ ڈویژن سے تعلق رکھنے والے گجر، اعوان برادری کے لوگوں نے بھنسیں رکھی ہوتی تھیں جس کا دودھ وہ تین حصے پانی ملا کے اپنا کاروبار چلا رہے تھے اور اس ہی پانی کی کمائی سے وہ لئی اور نالوں کے کناروں سے کرایہ کی عمارتوں سے نکل کے پوری پوری ہزارہ کالونیاں بنانے میں کامیاب ہو گئے اور ان کا پانی مزید چلتا رہتا مگر تحصیل اسمبلی میں قرارداد

پر عمل درآمد کرتے ہوئے انھیں بھینسوں کو شہر سے نکلنے کا حکم نامہ جاری کر دیا گیا وہ لوگ اپنی بھینسیں لے کر قریبی مضافات میں منتقل ہو گئے مگر انکا ذریعہ معاش اکثر کا آج بھی دودھ بیچنا ہے۔ وہ اب موٹر سائیکل اور گاڑیوں میں دودھ لا کے ان ہی علاقوں میں فروخت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ نالہ لئی کے قریب علاقوں میں مخصوص برادریوں کے مخصوص کام یا ذرائع معاش اور بھی ہیں جس میں ذبح خانے اور ذبح ہونے والے جانوروں کے اعضا، انتڑیاں وغیرہ کو پراسس کرنا، ان کے خون کو جلا کے مرغیوں کی خوراک بنانا اور پرانے کپڑے چن کے یا خرید کے دھو کے دوبارہ پیک کر کے قریبی احاطوں میں جہاں پر بے شمار لوگ گاڑیوں کو ٹھیک کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں ان کے آگے فروخت کرتے ہیں۔ اکثر پلوں کے کنارے انہی پرانے کپڑوں کے سٹال لگے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے جوتوں اور ٹائروں کا کام بھی شروع کر رکھا ہے جس سے اکثریت کی آمدن اور اثاثہ جات بڑھ گئے ہیں۔ بہت سی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے ان علاقوں کی خواتین بھی اب کام کاج کر کے اپنی روزی روٹی پیدا کرتی ہیں۔ اکثر تو قریب کی اچھی آبادیوں میں گھریلو ملازمہ ہیں۔ کچھ گھروں میں سلائی کڑھائی کر لیتی ہیں۔ پہلے تو پچاس فیصد خواتین گوبر سے اپلے بنا کے یا کاغذ چننے کا بھی کام کر لیتی ہیں مگر جو تھوڑی بہت علم بھی حاصل کر چکی ہیں۔ قریبی موجود دوائیوں، گھی اور کپڑے کی فیکٹریوں میں کام کرنے لگی ہیں۔ بہت سارے لوگ بہت سارے کاموں سے منسلک ہیں مگر جو چیز ان میں مشترک ہے وہ طبقہ سب مزدوری کرتے ہیں یا بہت چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں قریب کے بازاروں میں جتنے بھی مالک یا آڑھتی یا دوکاندار ہیں ان میں سے کوئی بھی ان علاقوں کا مکین نہیں صرف ان علاقوں میں تجارت کرنے آتے ہیں اور اگر کوئی بندہ خوش قسمتی سے کاروباری یا بڑا دوکاندار بننے میں

کامیاب ہو بھی جائے تو وہ اس علاقے کو چھوڑ کے کسی Develop علاقے یا نئی بنی ہوئی سکیموں میں منتقل ہو جاتے ہیں اور ان کا مکان کوئی اور غریب لے لیتا ہے۔ کچھ خواتین گھروں میں پھولوں کے ہار یا لفافے بناتی ہیں جو مڈل مین ان کو آ کر دیتا ہے اور بنوا کر خود آگے فروخت کرتا ہے۔

رہائش-مکانات

مراعات یافتہ طبقہ خواہشات کی تکمیل کے لیے مکانات بنانا ہے۔ اگر زیادہ ازواج ہیں تو ان کے لیے مکان زیادہ اولاد ہے تو ان کے لیے گھر۔ اس طرح اگر مختلف شہروں اور ممالک کے زیادہ وزٹ ہیں تو وہاں پر گھر بنائے جاتے ہیں جو طرح طرح ممتاز پیشہ ور نقشہ نویس اور ماہر تعمیرات بناتے ہیں۔ ہمارے ہاں رہنے کے لیے گھر یا مکانات کا کوئی سائز یا ڈیزائن مقرر نہیں جس کا جتنا دل چاہا یا جتنی جیب نے اجازت دی جگہ خرید لی، تین مرلے ہو یا پانچ یا سات مرلے بلکہ کسی کسی کے پاس دس مرلے بھی ہوتا ہے زیادہ تر تین سے پانچ مرلے والے پلاٹ یا مکان میں دو سے تین نسلوں کی محنت شامل ہوتی ہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ جس نے پلاٹ خریدا وہ خود بنائے اس میں رہ سکے اکثر لوگ اور گھر کے نزدیک گاؤں اور قصبوں سے ہجرت کر کے جب آتے ہیں تو وہ پہلے کرایہ پہ مکان لیتے ہیں عموماً ایک کمرہ ہوتا ہے اور غسل خانہ مالک مکان کا استعمال کرنا پڑتا ہے جو عموماً گھر کے کسی دوسرے حصے، چھت یا گراؤنڈ پر سیڑھیوں کے نیچے بچنے والی ترچھی جگہ میں بنا ہوتا ہے اور اس کا زیرزمین گٹر بھی سو میں سے دس یا بیس فیصد گھروں میں بنایا ہوتا ہے جس کا گند یا پرنالیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ باقی ماندہ اسی فیصد براہ راست پائپ باہر گلی میں بہنے والی نالی میں پھینک دیتے ہیں۔ کہیں کہیں اپنی مدد آپ کے تحت زیرزمین بچھنے والی سیوریج لائن میں بغیر کسی ٹریٹمنٹ کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر چار، پانچ بچوں کی پیدائش گاؤں میں ہوئی ہو تو (ہجرت سے قبل) وہ بچے جوان ہونے تک اسی طرح کے کرایہ کے گھر میں ہی رہتے ہیں۔ بس ایک سے دو کمرے کا گھر لینا پڑتا ہے۔ کبھی ایک گلی محلے میں اور کبھی

دوسرے یا تیسرے محلے میں، کبھی ایک منزل اور کبھی دوسری منزل پر منتقل ہوتے ہوتے بچے جوان ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک اگر کاروبار اچھا ہو یا کوئی بچہ یا خود بیرون ملک چلا جائے یا گاؤں سے آبائی جائیداد فروخت ہو جائے جو کئی کنالوں میں ہوتی ہے۔ بعض اوقات باپ دادا کی وفات کے بعد اپنے حصے میں آنے والی رقم اور بیوی کا زیور بھی فروخت کر کے تین سے پانچ مرلے کا صرف پلاٹ حاصل کرنے میں ہی کامیاب ہوتے ہیں پھر اگلی نسل کے کندھوں پر اس پلاٹ کو گھر یا مکان بنانے کی ذمہ داری ڈال کے باپ دوسرے جہاں چلا جاتا ہے یا پھر چارپائی سے لگ جاتا ہے۔ بوڑھے ماں باپ کی بس ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں پوتے پوتیوں کو کھیلتے دیکھیں۔ ان کی یہ خواہش اس وقت پوری ہوتی ہے جب اکثر ان کے زندگی کے آخری دن آ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کچا پکا گھر بن بھی جاتا ہے تو اس میں مرمت یا رنگ روغن کے لیے بھی اس وقت نوبت آتی ہے جب بچوں کی شادی بیاہ کا موقع آتا ہے۔ میرے والد نے 1979ء میں گھر لیا تھا جو کچے صحن اور دو کمروں پر مشتمل تھا۔ جب میری چھوٹی بہن کی شادی پر اس کی مرمت کا فیصلہ کیا گیا تو میری بہن نے بہنوئی سے کہہ کر مستری سے تخمینہ لگوایا تو مستری نے مشورہ دیا کہ اتنے خرچ میں ہی کچن کی جگہ کمرہ بن سکتا ہے دراصل مستری اپنی دیہاڑیاں بنانے کے چکر میں تھا اور مستری نے ماہرانہ رائے دی کہ کچن سیڑھیوں کے نیچے باتھ روم کے ساتھ ایک لینٹر ڈال کے بنا دوں گا اس کا خرچہ صرف بیس تیس ہزار ہوگا اس بے چاری نے کام شروع کروایا تو اسے سیمنٹ اور چپس کا بھاؤ پتا چلا اور داڑھی سے مونچھیں بڑی ہو گئیں۔ ایک لاکھ روپے لگوانے کے بعد بھی کمرہ کچن اور باتھ روم کے نہ تو دروازے لگ سکے نہ ہی کھڑکیاں۔ 29 سال بعد جب گھر میں دو کمروں اور بیٹھک کے ساتھ پکے کچن کی باری آئی تو صرف چند دن بعد جب صحن کے فرش کی رگڑائی مکمل ہوئی تھی والد صاحب انتقال کر گئے۔ یعنی

2008ء تک سب گھروں کے حالات ایسے ہی تھے اور یہ مکانات ایک سے دوسری یا تیسری منزل بہت کم تبدیل ہوئے ہیں۔ کمروں کی تعداد تو صرف خاندان بڑھنے کے ساتھ اضافہ کیا جاتا ہے۔

اصل مالک جس نے گھر بنانے کا خواب دیکھا ہوتا ہے اس کا پوتا بھی سکول سے کالج میں جا چکا ہوتا ہے۔ اسی کچے پکے مکان میں رہ رہے ہوتے ہیں۔ عموماً تین سے پانچ مرلوں میں دو کمرے پر مشتمل ہوتا ہے ایک سونے کے لیے، ایک مہمانوں کے لیے جسے بیٹھک کہتے ہیں جس کا دروازہ بھی گلی میں کھلتا ہے تا کہ مہمانوں کو گھر کے اندر نہ لایا جائے بلکہ باہر کے دروازے سے کمرے کے دروازے تک لایا جا سکے۔ ان گھروں میں باتھ تو بہت عرصے تک چھت پہ ہوتے تھے کیونکہ 1980ء کے اختتام کی دہائی تک خاکروب آتا تھا جو ایک لوہے کے ٹین میں لیٹرین سے غلاظت اٹھانے کے لیے گھروں میں آتا تھا اور ماہانہ تیس سے پچاس روپے اسے ملتے تھے جبکہ پانی ڈالنے میں گھر کی خواتین مدد کرتی تھیں 1990ء کے بعد باتھ چھت سے نہ صرف نیچے اتر آئے بلکہ سیڑھیوں کے نیچے سے کمرے کے اندر بھی دلہن کی فرمائش پر منتقل کیے جا رہے ہیں۔ چند لوگوں نے زیر زمین گٹر (ٹینک) بنائے مگر زیادہ تر نے صرف باتھ روم کی چار دیواری بنا کے اس میں سیٹ فلیش لگوایا اور اس کی نکاسی باہر کروا کے جان چھڑائی۔ خاکروب بھی ختم ہو گئے ہیں اور لیٹرین دھونے والا مٹی کا گھڑہ بھی ٹوٹ کے ختم ہو گیا ہے۔ مٹکا جو گھر کے پرنالے کے نیچے ہر وقت رکھا جاتا تھا بارش کے پانی سے بھرنے کیلیے وہ تو بالکل ختم ہو گیا ہے بلکہ حمام جو ہر گھر کے صحن میں برآمدے میں جو کمرہ کے آگے کھلی جگہ کے کچھ دو تین فٹ حصّے کو چھت کے بنایا گیا ہوتا ہے اس میں رکھ کے برتن دھوئے جاتے تھے کیونکہ کچن تو ان گھروں میں نہیں ہوتے ہیں اور وہ

پانی جو چھت کے پرنالے سے آ رہا ہوتا تھا اسی برآمدے میں رکھے حمام کے پانی کو ساتھ ملا کے بیٹھک کے آگے کہیں گھر کے درمیان میں کہیں سائیڈوں سے ہوتا ہوا غسل خانے یا لیٹرین سے ہوتے ہوئے باہر نکلتا تھا۔

عموماً بارشوں کا پانی باہر جاتے جاتے بڑی نالی بند ہونے سے اسی راستے سے گھر میں نالی سے واپس آ جاتا تھا اور اکثر کمروں کے اندر بھی چلا جاتا تھا جہاں قالین تو دور کی بات ایک عدد چٹائی جو پھٹ جاتی اور وہ بھی اس کمرے میں ڈالی ہوتی تھی جہاں یہ فرش میں بہت گھڑھے ہوتے ہیں اور ایک چٹائی کے پھٹ جانے کے بعد اس کو اٹھا کے پھینک کر اُس کی جگہ دوسری چھوٹی چٹائی ڈالی جاتی ہے جب یہ بارش کے پانی سے خراب ہو جاتی ہے تو بارش ختم ہونے کے بعد اس ساری چٹایوں کو کوئی دن چھت پہ دھوپ لگوائی جاتی تھی آج بھی یہ حالات ہیں مگر کہیں کہیں خاندانوں کی تیسری نسل پل کر بڑھ چکی ہے جو قدرے ماڈرن ہوگئی ہے اور انھوں نے اب کھلی نالیوں کو پلاسٹک کے پائپ سے ڈھک دیا ہے اب یہ پانی زیرزمین باہر نالی تک جاتا ہے اور باتھ روم اور کچن کے بھی اس طرح الگ الگ بلکہ دوسری منزلوں پہ بھی موجود دوسرے پورشن کا بھی پانی پلاسٹک کے پائپ لگا کے باہر نکالا گیا ہے اور ایک نالی کئی پایوں میں تبدیل ہوگئی ہے اور پانی کی مقدار بھی زیادہ نالیوں میں آنی شروع ہوگئی۔ سب گھروں میں حماموں نے زیرزمین ٹینکی یا چھت کے کسی حصے میں پلاسٹک کی کہیں کہیں سیمنٹ کی بھی ٹینکیوں کی شکل اختیار کر لی تھی کہیں تو صرف ڈرم کو ہی ٹونٹی لگوا کے چھت پر رکھ لیا ہے البتہ گیزر چاہے بجلی کا ہو یا گیس کا دس سے بیس فیصد لوگوں نے تو لگوا ہی لیے ہیں اور ان کے زیادہ تر فیملیز پہ جھگڑے ہونے کی وجہ سے ہر مکان پہ ایک سے دو اور اکثر تین تین بھی بجلی اور گیس کے گیزر لگوا لیے ہیں مگر پانی تو صرف بجلی کی موٹر سے چھتوں پر چڑھتا ہے چاہے وہ وہ واسا کے نلکے ہوں یا اپنا بور ہو۔ بہت کم کنوئیں رہ گئے ہیں کہیں

کہیں پانچ سو ہزار گھروں میں سے دس یا پچاس لوگوں نے کنوئیں رکھے ہیں وہ بھی نلکے میں پانی نہ آئے تو اس میں سے پانی بھرتے ہیں پہلے زیادہ تر گھی کے خالی لوہے والے ڈبے میں لوہے کی تار ڈال کے اسے رسی کے ساتھ باندھ کر پانی نکالا جاتا تھا اور اگر وہ ڈبہ گر جائے تو پورے محلے میں صرف ایک گھر میں کنڈے ہوتے ہیں جو ایک سریے کو ٹیڑھے کر کے بنائے ہوتے تھے اور اسی سے کنوئیں سے ڈبے نکالے جاتے تھے۔ اکثر اپنا ڈبہ نہیں ملتا مگر دوسرے پرانے ڈبے جنھیں زنگ لگا ہوتا ہے وہ دو تین مل جاتے ہیں اسی میں جو بہتر ہوتا ہے اسے دوبارہ رسی کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا یہ تو میرے بچپن کی باتیں ہیں آج کل تو کنوئیں بند کر دیے گئے ہیں۔ جدید زمانے میں اب واٹر سپلائی کے ذریعے لوگوں کے گھروں میں پانی آتا ہے لیکن اس کی ایک خامی یہ ہے کہ نلکوں میں آنے والی پانی میں گندے پانی کی ملاوٹ ہوتی ہے یا زنگ آلود اور بدبودار پانی آنے لگتا ہے جس سے لوگوں میں مرض بڑھنے لگے۔ سیوریج یا نالی کا پانی پائپ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹرز لوگوں کو عموماً پانی ابالنے کی یا صاف پانی پینے کی تلقین کرتے ہیں تو لوگ اپنی سمجھ کے مطابق یا سمجھداروں کے مشورے پر کنوئیں کے پانی کو محفوظ سمجھتے ہیں کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ پانی کافی دیر سے ٹھہرا ہوتا ہے اور زمین سے فلٹر ہو کر نکلا ہوتا ہے۔ اکثر لوکل باڈیز سسٹم کی وجہ سے ان علاقوں میں ناظمین و نائب ناظمین یا کونسلرز کے فنڈز اور عوام کے مطالبے پہ فلٹریشن پلانٹ بھی لگے ہوئے ہیں مگر ان کے صرف کمرے ہی اچھے بنے ہوئے ہیں ان پر ٹائلز بھی لگائی گئی ہیں اور تین سے چار لاکھ میں تیار ہونے والے پلانٹ میں جو پانی کو صاف کرنے کا پلانٹ اور مشین ہے وہ لوکل ہوتی ہے اور قریبی آبادیوں میں لوگ خود بنا رہے ہوتے ہیں۔ نیا فلٹریشن پلانٹ پانچ چھ ماہ تک صاف پانی دیتا ہے پھر نہ تو اس کا فلٹر کوئی تبدیل کرتا ہے اور نہ ہی ٹوٹیاں جن کو اکثر کوئی نشئی اتار کر لے جاتا ہے اس کو دوبارہ لگایا جاتا ہے اور اگر اس

کے مرمت کے لیے لوکل نمائندے اپنی اسمبلیوں میں سوال اٹھائیں تو واسا اور ٹی ایم اے کوئی بھی اسے اپنی ملکیتی نہیں مانتا بلکہ ناجائز بچے کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ البتہ ان پر لگی ہوئی تختیاں بڑی چمک دار ہیں سنگ مرمر یا سٹیل سے بنی ہوئی ہیں ناظم تو ناظم ایم این اے اور ایم پی اے بلکہ سنیٹرز اور وزیر بھی شوق سے ایسے علاقوں میں آ کر تختیاں اور نام نہاد فلٹریشن پلانٹ لگا کے جا رہے ہیں مگر نہ تو ان علاقوں میں مکانات کا پرسان حال ہے اور نہ ہی پلانٹس اور بجلی کے کھمبوں پہ لٹکتی کئی تاروں کے گچھوں کا۔ البتہ ایک چیز جو سب سے وافر مقدار میں وہ ہیں بچے۔ پورے ملک کی طرح ہمارے ہاں بھی بڑھتی ہوئی آبادی پچیدہ مسائل کا سبب بن رہی ہے۔ مکان وہی تین یا پانچ یا سات مرلے کا ہو جو کبھی باپ نے چھ سات بچوں کے لیے بنایا ہوتا ہے وہ تین سے سات یا نو کمروں میں بھی تبدیل ہو جاتا مگر ان سات سے نو کمروں میں 35 سے 40 افراد رہنے پر بھی مجبور ہو رہے ہیں اور اب ایک کمرے میں ہی ماں باپ کے ساتھ تین سے پانچ بچے رہ رہے ہیں البتہ ان کے ہاں ایک کمرے میں ایک ٹی وی ضرور آ گیا اور اسے دیکھ دیکھ کے ان کے باتھ رومز میں شیمپو اور لال صابن کی جگہ سیف گارڈ آ گیا ہے اور باتھ روم میں بھی کیمیکلز سے صفائی ہونے لگی ہے اور کچن میں جو بھی بہت سے بچے ایک ہی چارپائی پہ چولہے کے ساتھ رکھی پیڑھی پہ بیٹھ کے کھانا ایک چھوٹی سی لوہے کی پلیٹ میں ایک آلو اور ایک بوٹی ہر بچہ کھاتے تھے اب وہ ڈونگے میں سالن اور اس کے ساتھ پلیٹ اور چمچ لے کر گھر کے پکے حصے میں چٹائی ڈال کے اکٹھے بھی کھانے لگے ہیں البتہ ان گھروں میں سونے کے لیے اکثر لکڑی کے ڈبل بیڈ آ گئے ہیں اور اب میاں بیوی بچوں کو دوسری چارپائی پہ سلا کے اس بیڈ پہ اکٹھے سو جاتے ہیں بس ان کے سونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

لباس

ہمارے ہاں ہر قوم، زبان اور ثقافت کے لوگ ایک ہی حالات میں رہتے ہوئے لباس کا اپنے اپنے طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ صرف ایک قدر مشترک ہے وہ ہے مالی حالات۔

ان علاقوں میں ہر قوم، نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اپنے علاقوں کے رسم و رواج کے مطابق لباس پہنتے ہیں۔ آپ کو خواتین ٹوپی والے برقعے پہنے ہوئے بھی نظر آئیں گی اور سر سے دوپٹہ اُترے ہوئے بھی لیکن جو چیز مشترک ہے وہ ہے جدید لباس کا تیزی سے استعمال۔ یعنی ساڑھی، پینٹ یا لہنگا جو بھی ٹی وی میں دیکھتے ہیں وہ خواتین اپنی نوعمر بچیوں کو شوق سے سلا کے دیتی ہیں جن کی عمر ابھی پندرہ سال سے کم ہوتی ہے۔ جو اس طرح کا لباس پہن سکتی ہیں۔ بڑی عورتیں کبھی نصیب سے ساڑھی اپنی کئی ماہ کی جمع پونجی اکٹھی کر کے بنا بھی لیں تو انھیں پہننے کی اجازت صرف اسی صورت ملتی ہے کہ اوپر برقعہ یا بڑی چادر اوڑھ کے گھر سے باہر منعقدہ تقریب میں جا سکتی ہیں اور ایسا کرتے وقت گھر کا مرد سربراہ یا بڑا بھائی، بیٹا دیور کبھی بھی اس کے ہمراہ جانا گوارہ نہیں کرتا۔ زیادہ تر خواتین صرف بڑی بڑی چادریں اوڑھتی ہیں اور کوئی کوئی اس پہ نقاب کر لیتی ہیں۔ برقع اب فیشن بن رہا ہے اور ٹوپی والا برقعہ صرف مہمند افغانی یا قبائلی خواتین تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے لیکن لگتا ہے ان علاقوں سے نکلنے کے بعد وہ سارے برقعے صوبہ پختونخواہ کے قبائلی علاقوں، پشتون بیلٹ بلکہ شہروں میں بھی زبردستی طالبان بچیوں پہ لاگو کر رہے ہیں جبکہ اسی صوبے کے ان علاقوں جو بہت قدیم بھی ہیں اور دور دراز جیسا کہ ہزارہ ڈویژن جس کا

کافی حصّہ پہاڑوں پر مشتمل ہے ان سے میرا بھی تعلق ہے اس میں آج سے کئی سال قبل جب ہر کوئی برقع اوڑھتا تھا اس وقت بھی بڑی چادر تک کا رواج نہ تھا۔ میری نانی اور دادی بھی ایک مخصوص گرم شال سردیوں میں صرف اوڑھتی اور گرمیوں میں ایک دو گز کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑ جو صرف سر ڈھانپتا تھا اسے سر پر باندھ کے رکھتی تھیں لیکن قمیض گھٹنوں سے پائنچوں تک اور کھلی کھلی شلوار یہ بھی چھ میٹر کپڑا لگواتی جس میں چنیٹ ہوتی تھی جسے آج کل پھر شہروں میں دھوتی شلوار کی طرح استعمال کیا جارہا ہے۔ وہی خواتین جب ہجرت کر کے آنے والے اپنے بچوں کو ملنے ان علاقوں میں آنے لگیں تو انھیں بڑی بڑی چادریں اور نقاب کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کھلے علاقوں کے لباس اس طرح آپ کو چھپنے پر مجبور نہیں کرتے جس طرح ان تنگ و تاریک اور جڑے ہوئے گھروں میں رہنے والے مجبور ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس وقت زیادہ اہمیت کی حامل ہوجاتی ہیں جب ان علاقوں میں بسنے والے لوگ صرف عید، بکرعید یا کبھی کبھار شادیوں پر ہی لباس سلوانے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے لیے بھی انھیں یا تو کئی ماہ تھوڑی تھوڑی رقم بچا کے کمیٹی ڈالنا پڑتی ہے یا پھر ان علاقوں میں آنے والی پھیری والی خواتین یا مرد جو سو روپے ماہانہ اقساط پر تین سو کا جوڑا انھیں پانچ یا چھ سو روپے میں فروخت کرتے ہیں۔ ان سے لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ہر ماہ اگر پیسے نہ دیں تو اکثر ان کے گھروں کے مردوں سے جھگڑے کا بھی باعث بنتا ہے۔ پھر اس جوڑے کی سلائی کا مرحلہ آجاتا ہے بچیوں نے تو کہیں نہ کہیں سلائی سینٹرز یا اپنی بوڑھیوں سے سلائی بھی سیکھ رکھی ہوتی ہے اور ماں کو جہیز میں ملنے والی سلائی مشین بھی ان تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے جو بار بار دھاگہ یا سوئی توڑ دیتی ہے اس وجہ سے وہ اس پہ اپنے ان بہن بھائیوں کے لیے تو کپڑے سی لیتی ہیں جو ابھی بول نہیں سکتے جو بولنا سیکھ لیتے ہیں پھر ان سے کپڑے عام طور پر نہیں سلواتے بلکہ درزیوں سے سلواتے ہیں۔ مردوں کا لباس شلوار

قمیض ہی ہوتا ہے کچھ مرد بوڑھے دھوتی باندھتے ہیں جبکہ زیادہ تر شلوار قمیض پہنتے تھے جو انھیں سال میں ایک آدھ دفعہ عید پر ہی بنانے کا موقع ملتا ہے۔ درزی عموماً ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور چھوٹی سی آدھے کمرے کی دوکان میں شیشے کے باہر دروازے پہ ہاتھ سے لکھ کے لگا دیا جاتا ہے دسویں روزے کے بعد سلائی بند اندر خانے بھلے وہ سلائی کے لیے کپڑے لیتا رہتا ہے اور بکنگ نہ ہونے کا بہانہ کر کے منہ مانگے دام وصول کر لیتا ہے۔ درزی کیا کرے بے چارہ اس کو بھی اپنے بچوں کے عید کے کپڑے بنانے ہوتے ہیں جو اکثر چاندرات کو مہنگے داموں خریدے جاتے ہیں۔ نو جوانوں میں تو شلوار قمیض کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ ٹی وی ڈرامے دیکھ دیکھ کے اور سکول کالج میں آنے والے دوسرے علاقوں کے لڑکوں کا لباس دیکھ دیکھ کے وہ بھی پنٹ شرٹ پہننے کو ترجیح دیتے ہیں جس کے لیے انھیں جامع مسجد روڈ پر واقع بڑا بازار ہو یا صدر میں اسٹیشن کے قریب واقع پرانے کپڑوں کے سٹال بلکہ گنج منڈی کے پل پر بھی اکثر جمعہ اور اتوار کو بیرون ممالک سے آئے پرانے کپڑے یا مقامی امیر زادوں کے پھینکے ہوئے یا خیرات کیے ہوئے کپڑے ان کو اکثر سستے داموں مل جاتے ہیں۔ پاؤں میں زیادہ تر کو ہاٹی چپل یا کھیڑی جب کہ کوئی پلاسٹک کے بنے چپل بھی پہنتے ہیں اور جو یہ بھی خریدنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ پھر پرانے اور لنڈے بازاروں کا رُخ کر کے اچھے اور امپورٹڈ جوتے لے کر پہن لیتے ہیں۔ خواتین گھروں کے قریب چھوٹے موٹے سٹور سے جوتے جو زیادہ تر لوکل یا چائنہ کے مل جاتے ہیں وہ استعمال کرتی ہیں۔

اکثر خاندانوں میں عموماً پشتونوں یا دیہی علاقوں (پہاڑی) سے تعلق رکھنے والے خاندانوں میں بچوں کی پیدائش پہ ممانیاں دادیاں، چاچیاں بچے کے لیے پرانے کپڑے پھاڑ کے ایک تلائی یا بچھونا بناتی ہیں جس میں پرانے کپڑے اور پلاسٹک شیٹ بھی

لگائی جاتی ہے تا کہ اس کا پیشاب بستر نہ گندا کرے بناتی ہیں اس طرح بچے کے باپ یا دادے کے پرانے کپڑوں کو پھاڑ کے لنگوٹ (تکون کپڑے) بنائے جاتے ہیں جس کو باندھا جاتا ہے اور اس طرح کرتے یا قمیض بھی بنائی جاتی ہیں اور عموماً اس کی پیدائش سے چالیس دن تک اسے نئے کپڑے یا تو بالکل نہیں پہنائے جاتے یا پھر اسے حفاظتی ٹیکہ لگوانے یا ڈاکٹر کو چیک کروانے کے لیے لے جاتے ہوئے ایک آدھا نیا جوڑا جو اکثر تحفے میں آتا ہے وہ پہنایا جاتا ہے پھر لباس کو دوبارہ استعمال کرنے کا رواج پیدائش کے علاوہ مرنے کے بعد بھی کیا جاتا ہے کہیں بھی مرنے والے کے کپڑے پھینکے نہیں جاتے بلکہ اکثر خاندان محلے میں کسی غریب کو دے دیے جاتے ہیں بس مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ لباس کسی نمازی پرہیز گار کو زیادہ تر غریب لوگوں کو دے دیے جاتے ہیں انسان ختم ہو جاتا ہے مگر کپڑا پھٹنے تک یا دوبارہ روئی یا نیا کپڑا بننے تک استعمال میں رہتا ہے۔

شادی

میں نے عام طور پر محسوس کیا ہے کہ امیر گھرانوں میں شادی بھی کاروبار سے کم نہیں ہے۔ پھر اس کے لوازمات بھی ایسے ہوتے ہیں۔ کس ہوٹل میں مہندی ہوگی، کس باغ میں ولیمہ، قوال کون ہوگا؟ اور ڈانس پارٹی کون کون سی مدعو کی جائے گی۔ ہر پروگرام کا مہمان خصوصی کون ہوگا؟ اور اس کی خبر الیکٹرونک یا پرنٹ میڈیا پر کیسے چلے گی۔ عروسی جوڑے بنانے کے لیے گاریگر کہاں سے آئیں گے؟ میک اَپ کے لیے کس نامور شخصیت کو بلایا جائے گا۔ ہنی مون کس جگہ یا کس ملک میں ہوگا؟ کھانے کی ڈیشنز کیا ہوں گی؟ غریب آبادیوں میں بھی شادی کی باقاعدہ تاریخ طے کی جاتی ہے۔ چند معززین بزرگ خواتین و مرد، لڑکی والوں کے گھر جا کر ان سے مقررہ تاریخ طے کرتے ہیں جو عموماً سردیوں یا گرمیوں کے اختتام کے بعد کے مہینوں میں کوئی مذہبی تہوار نہ ہو تو طے کی جاتی ہے۔ محرم، رمضان، ربیع الاول کے علاوہ دن رکھے جاتے ہیں جو عموماً عیدوں کے فوراً بعد کی تاریخیں ہوتی ہیں۔ شادی بیاہ کئی دن کی سرگرمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ کئی دن پہلے لڑکے والے اور لڑکی والوں کے گھر ڈھولک رکھ لی جاتی ہے اور گلی محلے کی خواتین زمین پر دری (قالین) ڈال کے گروپ میں بیٹھ کے ماہیے، ٹپے اور فلمی گانے بھی گاتی ہیں۔ ان کے لیے بڑے سے پتیلے میں چائے بنائی جاتی ہے۔ الا بچی بھی چینی میں ڈال کے انھیں پیش کی جاتی ہے تاکہ ان کے گلے خراب نہ ہوں۔ مسلسل کئی دن یہ رسم جاری رہتی ہے جو کبھی تین دن، کبھی پانچ دن پہلے شروع کی جاتی ہے۔ پھر مائیوں کا دن آ جاتا ہے۔ لڑکی کو تو شادی کے دن مقرر ہونے کے بعد گھر میں ایک کونہ کو سجا کر اس میں بٹھا دیا جاتا ہے اور وہ گھر سے باہر نہیں

جاتی۔اس کے گھر والی خواتین اسی کے لیے تمام انتظامات خود کرتے ہیں تین دن قبل لڑکے والے با قاعدہ خواتین کے گروپس جو دس سے سو تک ہو سکتے ہیں اس کے لیے مہندی لے کر آتے ہیں اور لڑکی کی مائیاں کرتے ہیں۔دلہن کو گھر کے کھلے کمرے یا صحن میں کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے۔اکثر کمرے میں زمین پر بھی بیٹھ کے مائیاں ڈال دیتے ہیں۔پھر مائیوں کی رسم کا آغاز سہاگنوں سے کیا جاتا ہے۔لڑکی یا لڑکے والوں کی ہی عزیز و اقارب یا دوست احباب ہوتے ہیں۔

شرط یہ کہ صرف اس کا شادی شدہ ہونا ہی کسی بیوہ یا مطلقہ یا کنواری کو مائیاں ڈالنے سے منع نہیں کرتے مگر پہلے سات سہاگنیں پیالی میں رکھے خوشبو دار تیل سے ہاتھ گیلا کر کے لڑکی کے سر میں لگاتی ہیں اور یہ کرنے سے قبل وہ کچھ رقم حسب توفیق اس دولہن کے ساتھ بیٹھی عورت کے ہاتھ میں رکھی پلیٹ یا اس کے پھیلائے ہوئے دوپٹے میں ڈال دیتی ہیں جو دولہن کی بڑی بہن، بھابی، پھوپھی، چچی یا کزن یا کوئی دوست ہوتی ہے اسے اختیار دیا جاتا ہے۔زیادہ تر وہ رقم اسی کو دے دی جاتی ہے مگر غریب خاندان والے اکثر چند روپے اس خاتون کو دے کر باقی رکھ لیتے ہیں اور شادی میں خرچ کرتے ہیں۔مٹھائی کا ڈبہ اور خوشبو دار تیل اور مہندی کے با قاعدہ کئی تھال جو پلاسٹک یا گتے کے سجے سجائے تھال بازار سے ملتے ہیں۔اس میں مہندی اور موم بتیاں سجائے نوجوان لڑکیوں سے اٹھوائے جاتے ہیں اور راستے میں بھی وہ تھال اور موم بتیاں جلائی جاتی ہیں یہ سب لڑکی کی مائیوں میں لڑکے والوں کی طرف سے اور لڑکے کی مہندی میں لڑکی والوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔زیادہ تر لڑکی کو پیلا جوڑا پہناتے ہیں اور اسے سب سہیلیاں باری باری گانہا باندھتی ہیں اور جو لڑکیاں شادی میں گانہا باندھنے کی رسم ادا کرتی ہیں وہ لڑکی ساری زندگی ان سے دوستی نبھاتی ہے اور ان کی شادی میں اور دیگر موقعوں پر گانہے کی سہیلی کہہ کر ہر حق ادا کرنے کی پابند ہوتی ہے

بلکہ ان کے پیدا ہونے والے بچوں کی شادیوں میں اس خالہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ زیادہ تر گانہے تلے دار تاروں سے بنے ہوتے ہیں۔ اب لوہے، تانبے بلکہ چاندی کے بھی گانہے بازار میں مل جاتے ہیں۔ پھولوں کی مالا اور گھانے بھی پہنائے جاتے ہیں۔ پہلے زمانے کی خواتین خشک میوے، ناریل، چھوہارے کو سوئی دھاگے میں پرو کے گانہا بناتی تھیں اور اسے لڑکی کو بارات والے دن بھی باندھے رکھتے ہیں اور سہاگ رات کو وہ اپنے شوہر کے ہاتھوں کھلوا کے اسے پیش کرتی تھی جو اس کی طرف سے خاطر تواضع کا آغاز ہوتا تھا اور طاقت اور صحت برقرار رکھنے کے لیے دولہا دلہن کو کھلایا جاتا تھا مگر اب صرف زرق برق گانہے ہی پہنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح لڑکے کو بھی گانہے باندھے جاتے ہیں اس کی مائیوں والے دن جو اس کی بہنیں، بھابیاں اور لڑکے کے دوست باندھتے ہیں جو عام طور پر طاق ہوتے ہیں۔ عموماً سات تک گانہے کے دوست اور سہیلیاں بنائی جاتی ہیں جو زندگی بھر کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ لڑکے کی مہندی یا مائیوں میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے اسے بھی سر پہ سرخ دوپٹہ اوڑھایا جاتا ہے اور خوشبودار تیل لگایا جاتا ہے مگر ایک خاص رسم اسی دن اور ہوتی ہے اور وہ ہے اس کا ناراض ہونا جو عموماً مائیوں والے دن اور کبھی کبھی بارات والے دن بھی منائی جاتی۔ دولھے کو جب دلہن والے مائیاں ڈالنے آتے ہیں تو دولھا چپکے سے کسی دوست یا عزیز کے گھر چلا جاتا ہے تو اسے منایا جاتا ہے اور اس کو اس کی شرائط پر واپس لاتے ہیں جو عموماً بارات میں لوگوں کی تعداد، حق مہر کی رقم یا زیور یا کوئی اور شرط طے کروا کے آتا ہے۔ پھر اسے بھی کرسی پہ بٹھا کے باری باری مرد اور عورتیں مل کے تیل لگاتے ہیں اور اسی طرح پیسے بھی ڈالتے ہیں آج کل تو میں نے ایک امیر اور محلے کے کھڑ پنچ کی بیٹی کی شادی میں مائیوں میں گانہے اور تیل کے ساتھ سونے کی انگوٹھیاں، لاکٹ اور دیگر تحفے اور ہزاروں روپے بھی دیتے ہوئے دیکھا ہے اپنی اپنی حیثیت کی بات ہے۔

دونوں کی مہندی کی رسموں سے فارغ ہوکر بارات کا دن آ تا جب اس دن لڑکے والے سہرابندی اور روانگی بارات کی خوشی میں ہوتے ہیں جبکہ لڑکی والوں کے گھر وہ دن سوگ اور رخصتی کا ہوتا ہے جو عموماً رودھو کر گزرتا ہے زیادہ تر سمجھدار لوگ شادی کے دن رکھنے والے دن سے ایک ہفتہ قبل نکاح کر لیتے ہیں تا کہ حق مہر اور دیگر معاملات سے بدمزگیاں نہ ہوں مگر عام طور پر لوگ نکاح بارات والے دن ہی کرتے ہیں اور اس میں عموماً کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں سب معاملات طے ہوتے ہوئے لڑکی والے اپنی بچی کے مستقبل کے حوالے سے فکر مند ہوتے ہیں وہ زیور، نقد رقم اور ماہانہ خرچہ وغیرہ جو کبھی پہلے سے طے ہو جاتا ہے اور کبھی موقع پر بحث ومباحثہ جھگڑے سے طے ہونے کے بعد لڑکے والے الگ کمرے میں مردوں میں گواہ اور مولوی کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں جبکہ لڑکی ایک کمرے میں بند خواتین بزرگوں اور سہیلیوں کے ساتھ چادر میں لپٹی بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک وکیل اور دو گواہ مقرر ہوتے ہیں جو زیادہ تر سگے ماموں، چچا، تایا، خالو یا قریبی رشتہ دار بزرگ اور محلے دار بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ لڑکی کے کمرے میں نکاح کا فارم لے کر جاتے ہیں اور بلند آواز میں وکیل دلہن کو لڑکے اس کے باپ کا نام اور رقم مہر یا شرائط پڑھ کے سناتا ہے۔ تین دفعہ بولتا ہے اور لڑکی زیادہ تر کافی دیر رونے کے بعد ہاں کرتی ہے اسے خصوصی ہدایت ہوتی ہے کہ جلدی ہاں نہ کرے۔ میں نے گاؤں میں خود دیکھا ہے کہ چھ چھ گھنٹے وکیل کو انتظار کرنا پڑتا۔ میرے ماموں کی شادی پر جب صبح اذانوں کے وقت بھی جب ہاں نہ ہوئی تو مردوں نے تنگ آ کر بزرگ خاتون سے کہا کہ اس کا سر پیچھے سے نیچے کرو تو ہم ہاں سمجھ لیں گے۔ ایسا ہی کیا گیا مگر آج کل ہمارے ہاں لڑکیاں کم از کم بیس منٹ یا آدھے گھنٹے بعد انگوٹھا یا دستخط کر دیتی ہیں۔ پھر سب کو مبارک باد دی جاتی ہے۔ مٹھائی لڑکے والوں کی طرف سے آتی ہے اور خاص طور پر چھوہارے کی بد جو پہلے اور ٹرے میں پیش کیے جاتے تھے آج کل بازار

سے سجی ہوئی تھیلیوں یا پلاسٹک کے لفافوں میں ٹافیاں، بادام اور چھوہارے ملا کے تیار کروائے جاتے ہیں جو سب میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بِد کی مقدار لڑکے والوں کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد دولہن اور دولہے کو اکٹھے دو کرسیاں رکھ کے بٹھاتے ہیں مگر فوراً یہ موقع نہیں آ جاتا۔ دولہن کے ساتھ رکھی کرسی یا صوفے پہ پہلے سے سالی صاحبہ یا دولہن کی دوست عزیزہ تشریف فرما ہوتی ہیں اور وہ اس وقت تک نہیں اٹھتی جب تک اسے رقم ادا نہ کی جائے۔ اس کے بعد دولہا صاحب تشریف رکھ سکتے ہیں پھر سہیلیوں اور دوسری سالیوں کا نمبر آتا ہے اور وہ باقاعدہ مٹھائی کھلانے اور دودھ پلائی کی رسم ادا کرتی ہیں۔ اس پر بھی دولھے اور اس کے دوستوں کو رقم ادا کرنا پڑتی ہے جو چند سو سے چند ہزار ہوتی ہے۔ یہ سب کرنے کے بعد سب خاندان والے لڑکے لڑکی کو سلامی میں پیسے دیتے ہیں اور پھر رخصتی کا وقت آ جاتا ہے۔ لڑکی کے گھر آنے سے قبل لڑکے کے گھر سے بھی اس کی رخصتی ہوتی ہے جو باقاعدہ اسے سیج پر چڑھا کے یا سہرا باندھ کے اور اس کے گلے میں نوٹوں کے ہار ڈال کے کی جاتی ہے اور جتنے زیادہ ہار ہوں گے اتنی ہی زیادہ لڑکے کی عزت افزائی لڑکی کے گھر میں سلامی دیتے ہوئے ہوتی ہے اور لڑکا خوشی خوشی رخصت ہو کے لڑکی کے گھر آ جاتا ہے جبکہ لڑکی کی رخصتی تو بہت رو دھو کر ہوتی ہے۔ زندگی کے کئی سال ماں باپ کے ساتھ ہنسی خوشی گزارنے کے بعد اور جب ان کی محبت کا صلہ ملنے کا وقت ہوتا ہے تو وہ اسے خود سجا سنوار کے دولہن بنا کے سامان دے کر رخصت کر رہے ہوتے ہیں۔ سب عزیز اور رشتہ داروں کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔ چھوٹی اور تنگ گلیوں میں ابھی تک مسجد میں سے ڈولی منگوائی جاتی ہے جبکہ کھلی گلیوں والے گاڑی دروازے تک لے آتے ہیں۔ ڈولی پر عموماً سجی ہوئی لال چادر یا لڑکی کی خاندانی چادر ڈالی جاتی ہے اور پھر قرآن مجید اس کے سر پر رکھ کے اس کے سائے میں اسے ڈولی یا گاڑی میں بٹھایا جاتا ہے اور وہی قرآن مجید اس کی گود میں رکھ

دیا جاتا ہے اس سے قبل چاولوں کی پلیٹ بھروا کے لڑکی سے مٹھیاں بھروا کے گھر میں پیچھے پھنکوائے جاتے ہیں جس کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ اپنے نصیب ساتھ نہ لے جائے بلکہ ماں باپ کے گھر میں بھی چھوڑ جائے ، ماموں ، بھائی اور قریبی لوگ اسے کندھا دے کر گاڑی تک لے جاتے ہیں اس کے گھر تک چھوڑ کے آتے ہیں بلکہ پشتونوں کے قبائل میں اکثر میں نے دیکھا کہ کرسی پہ بھی بٹھا کے لڑکی کو چھوڑ آتے ہیں۔

لڑکے والوں کے گھر لڑکی کی ڈولی اس وقت تک اندر نہیں جاتی جب تک منہ مانگی رقم گھر، جانور یا کوئی تحفہ نہ لیا جائے اور یہ رسم پوری ہونے کے بعد لڑکی یہ واپس کر دیتی ہے وہ لڑکی ساری زندگی سسرال والوں کو جتاتی رہتی ہے کہ یہ زیور، مکان، جانور آپ نے میری ڈولی پکڑائی میں دیا تھا میرا احسان مانیں میں نے واپس کر دیا بلکہ میری والدہ کو تو پورا پہاڑ (جبڑی) ڈولی پکڑائی میں دادا نے دیا تھا اور وہ آج تک اسے اپنی ملکیت سمجھتی ہیں۔

عموماً لڑکے والوں کے گھر عورتیں لڑکی کو فوراً سب کو چہرہ نہیں دیکھنے دیتی بلکہ پہلے لڑکی کی گود میں قرآن مجید رکھتے ہیں اور وہ اس میں سے کچھ پیسے رکھ کے واپس کرتی ہے جو مسجد میں بھجوا دیے جاتے ہیں۔اسی طرح ڈولی والی رقم بھی لڑکے والے ادا کرتے ہیں اور وہ بھی مسجد کو دی جاتی ہے اور مولوی صاحب کو ویسے بھی نکاح پڑھاتے وقت پیسے دیے ہوتے جو ایک ہزار سے پانچ ہزار تک ہوتی ہے ان کے بھی مزے ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد دودھ کا گلاس پلایا جاتا ہے اس میں بھی لڑکی پیسے رکھ کے دیتی ہے اور پھر فوری طور پر یہ چھوٹا سا خوبصورت سا بچہ جو ہمیشہ لڑکا ہی ہوتا ہے مجبوری میں لڑکی بھی اس کی گود میں ڈال ڈالتے ہیں اور وہ اسے اپنی حیثیت یا ملکیت سے ملنے والی ہدایات کے مطابق رقم دے کر اُتارتی ہے پھر سب سے پہلے لڑکی کی ساس یا گھر کی بڑی اس کا منہ دیکھتی ہے اور سلامی دیتی ہے اور پھر سب باری باری اس وقت تک اکثر آدھی رات ہو چکی ہوتی

ہے اور عموماً ہمارے ہاں بہت کم پہلی رات دولہا دلہن کو سہاگ رات منانے کا وقت ملتا ہے بلکہ گھروں میں جگہ کم ہونے کی وجہ سے مہمان دولہن کے بیڈ اور صوفے پر بلکہ زمین پر بھی سو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار اگر کوئی خاندان میں تیز اور سمجھ دار خاتون ہو اور لڑکا بھی بااختیار ہو تو کوشش کر کے وہ صبح اذانوں سے قبل کمرے کو جبراً خالی کروا کے سہاگ رات منانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کے لیے کمرے کے دروازے پر کھڑی خاتون سربراہ کو بھی کوئی نہ کوئی تحفہ یا نقد رقم دینا پڑتی ہے پھر وہ اسے اندر جانے کی اجازت دیتی ہے بلکہ اس کمرے کا پہرہ بھی کرتی ہے کہ کوئی مہمان یا بچے انھیں تنگ نہ کریں۔

دولہا اپنے ساتھ حیثیت کے مطابق سونے، چاندی کے علاوہ کوئی دوسرا تحفہ یا نقدی منہ دکھائی میں دیتا ہے۔ نقدی تو اکثر واپس لے لی جاتی ہے مگر تحفہ لڑکی کی ملکیت ہو جاتا ہے اس کے بعد اگر اسے وقت یا موقع مل جائے تو باقی مراحل بھی طے کر لیے جاتے ہیں جس کے لیے اس کے پاس اذانوں تک کا وقت ہوتا ہے اور پھر اسے دروازہ کھٹکا کے فوراً باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اکثر نوعمر لڑکا تو صرف تعارف کروانے میں ہی کامیاب ہوتا ہے بعض اوقات اسے انھی دوستوں یا عزیزوں کی طرف سے اسپیشل ہدایات دی جاتی ہے کہ اگر سہاگ رات نہ منائی تو ولیمہ جائز نہ ہوگا۔ اس کے بعد لڑکا کسی حمام یا عزیزوں کے گھر جا کر نہا دھو لیتا ہے جبکہ لڑکی کو گھر کے کسی کونے میں موجود باتھ روم میں بزرگ خواتین کی ہدایت و پیش کش کے مطابق نماز سے قبل غسل کروایا جاتا ہے اور نماز بھی پڑھوائی جاتی ہے۔ لڑکی کے گھر والے صبح صبح ناشتہ بھجواتے ہیں جو اس کی بہنیں یا دوست لاتی ہیں۔ وہ ان کے ساتھ مل کے ناشتہ کرتی ہے یہ رسم بھی دو تین دن مسلسل دہرائی جاتی ہے۔

بارات والے دن ہی صبح صبح لڑکے والے کے ہاں کسی کسی مخصوص علاقوں سے تعلق رکھنے والے خاندانوں میں لڑکی والوں کی طرف سے گھڑولی (مٹی کا چھوٹا سا شیشوں

والا گھڑا) بھرنے کی رسم بڑی خوبصورتی سے منائی جاتی ہے جس کے لیے باقاعدہ گھر میں آئے مہمانوں کے علاوہ خصوصی محلے والی خواتین کو دعوت دی جاتی ہے اور بیس تیس خواتین بن سنور کے گھڑولی پہ لال دوپٹہ ڈال کے محلے کے کسی دور دراز گھر سے کنوئیں یا نلکے سے بھی پانی بھر کے لاتی ہیں۔ زیادہ تر ایسے وقت پر صرف خود ہی گانے گائے جاتے ہیں مگر کبھی کبھی ان محلوں میں آباد نٹنیاں (گانے بجانے والی) خواتین جو صرف چند سو روپے ایڈوانس لے لیتی ہیں اور باقی انھیں ملنے والی بدھائیوں پہ طے ہوتا ہے اور وہ گلے میں رسی لگے ڈھول کو بجائے پھٹے ہوئے گلے سے کبھی کبھی سر میں کبھی کبھی بے سرے پنجابی گانے گاتی ہیں اور اکثر لڑکے کی بہن یا بھابی بھی اسے سر پہ اٹھا کے لاتی ہیں اور جب وہ گھر پہنچتی ہیں تو دولہا اسے کچھ رقم دے کر اتارتا ہے اور پہلی بار تو لازمی طور پر دولہا کو اس پانی سے نہلایا جاتا تھا اور آج کل صرف اس پانی سے چھینٹا مار لیا جاتا ہے اور یہ رسم روانگی بارات سے دو تین گھنٹے قبل ادا کی جاتی ہے۔ عموماً مردوں کو ہی بارات میں لے جاتے ہیں۔ اسی لیے عورتیں بارات والے دن یہ رسم ادا کر کے ہی خوش ہو لیتی تھیں۔ اب تو خواتین بھی بارات میں جانے لگی ہیں۔

لڑکی والے گھر میں رخصتی والے دن صبح صبح اس کی سہیلیاں جو گانہا باندھنے والی ہوتی ہیں وہی محلے کے کسی گھر سے یہ رسم کرتی ہیں۔ اس موقع پر بہت کم گانا بجانا کیا جاتا ہے۔ البتہ دلہن کو صبح صبح اس پانی کو دوسرے پانی میں شامل کر کے نہلایا نہ جائے تو وضو لازمی کروایا جاتا ہے۔ اس موقع پر اذانوں کے وقت دلہن کا بھائی اگر سگا نہ ہو تو کزن اس کے بالوں کی ایک لٹ (چٹیا) کھولتا ہے اور دلہن کے کان میں ایک خاص نصیحت کرتا ہے۔ ساس سسر کا ماں باپ کی طرح خیال رکھنا وغیرہ وغیرہ کہتا ہے اور وہ بھائی یا کزن ساری زندگی اس دلہن کا خیال رکھنے کا پابند ہوتا ہے جو یہ رسم ادا کرے۔ اس کے علاوہ ایک اہم رسم ہمیشہ

لڑکے والوں کے گھر جوڑا لانے والی ہوتی ہے۔ ہمیشہ یہ رسم لڑکے کے دوست کبھی کبھی دوسرے محلے میں رہنے والی بہن یا پھوپھیاں ، چاچیاں کرتی ہیں۔ ایسے موقع پر سر سے پاؤں تک جوڑا، جوتے ، رومال، کنگھی شیشہ، تیل، صابن، مٹھائی گانہا، اکثر سونے کی انگوٹھی وغیرہ کے بیسن اور میدے کی بنی باقرخانیاں جن کے درمیان سوراخ ہوتا ہے وہ لوہے اور پلاسٹک کی ڈشوں میں باقاعدہ سجا کے ان کے اوپر گوٹا والے اور کروشیے کے کڑھائی والے کپڑے ڈال کے لائی جاتی ہے۔ جس کی جتنی زائد تعداد ہو اتنا ہی اچھا تاثر ہوتا ہے۔ یہ سوغات نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں سے اٹھوا کے لائی جاتی ہیں اور ایسے موقع پر عموماً بینڈ یا ڈھول والے کا تو بہت زیادہ رواج ہوتا ہے اور جتنی زیادہ خواتین ہوں اتنے ہی شادی کے گھر والے لوگ نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ ان کے لیے باقاعدہ بیٹھنے اور چائے پانی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ ایک سے پانچ جوڑے ایک ہی شادی میں آتے ہیں۔

بارات اور رخصتی کروانے کے بعد اگلا اور آخری مرحلہ ولیمے کا ہوتا ہے جس میں ایک دیگ سے کئی دیگوں کا انتظام اپنی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ ولیمہ عموماً گھروں کی چھتوں پر یا گلی میں ٹینٹ لگا کر کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی کے پلاٹ میں یا قریبی خالی میدان میں اور کبھی کبھی قریب کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور شادی گھروں میں بھی کھانا دیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اکثر ان کی ساری زندگی کی جمع پونجی اور پنشن خرچ ہو جاتی ہے جب کہ اکثر اوقات تو ادھار بھی لینا پڑتا ہے۔ کوئی تو اس کے لیے اپنا کوئی اثاثہ بھی فروخت کر دیتے ہیں تاکہ برادری اور محلے میں عزت ہو کہ فلاں نے ولیمہ ہوٹل میں کیا تھا۔ پھر ایسے موقع پر لوگ بھی صاف ستھرے اور خصوصی بلائے جاتے ہیں جو سو سے ایک ہزار تک سلامی تو دے سکیں لیکن کہتے ہیں کہ یہ آپ کا دیا ہوا واپس آتا ہے یا آپ کا ادھار آج آپ کو سو روپے کل دو سو دینا پڑیں گے یا آپ سے کبھی سو روپے ہو تو لوگ آپ کو دو سو دیں

گے البتہ ایسے موقع پر عموماً جو وقت کھانے کا طے ہوتا ہے اس سے چار گھنٹے بعد ہی لوگوں کو کھانا ملتا ہے اور وہ بھی عموماً پہلے مرحلے میں صرف مرد حضرات ہی کھاتے ہیں۔ ولیمہ ہال میں ہو یا محلے کی چھت پر خواتین کو عموماً شام پانچ چھ بجے کبھی کبھی چار بجے کھانا ملتا ہے۔ اس میں بھی بچے مردوں کے ساتھ کھا لیتے ہیں۔

منگی یا دعائے خیر کی رسم

ہماری طرح فلموں، ڈراموں اور افسانوں میں لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو منگنی کی انگوٹھی پہناتے ہیں اور سب کے سامنے ہوتا ہے۔ ہمارے علاقوں میں جو رسم و رواج متعین ہیں وہ اس سے بالکل برعکس ہیں جسے مختصراً تحریر کرنے کی کوشش کروں گی۔

جب بھی کوئی دو خاندان رشتہ دار ہوں یا غیر تو وہ اپنے بچوں کی شادی سے قبل منگنی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اس کے لیے وہ ایک دوسرے کے گھر بار بار کبھی مٹھائی، کبھی پھل وغیرہ لے کر (حسب توفیق) آنا جانا شروع کرتے ہیں۔ بعض اوقات انہی دنوں یا سالوں میں کامیابی ہوتی ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لڑکی کا حسب نسب اس کے خاندان کے مالی یا سماجی حالات، اس کا حسن، عمر وغیرہ البتہ تعلیم کو تو بہت کم معیار سمجھا جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں کئی بار آنے جانے کے بعد ہی پرکھی جاتی ہیں اس طرح لڑکے کو بھی جانچا جاتا ہے جب یہ مراحل طے ہو جائیں تو پھر باقاعدہ سے خاندان کے اہم بزرگ مرد یا عورت کے ہاتھ رشتہ بھجوایا جاتا ہے اور لڑکی والوں کی طرف سے ہاں یا مثبت جواب کی صورت میں منگنی کا اعلان کرنے کے لیے دن مقرر ہوتا ہے کہ کس دن منگنی طے کرنی ہے۔ (تفصیل سے ایک الگ نشست میں لکھوں گی)

شادی کی تاریخ مقرر کرنے کا طریقہ

منگنی، شادی کی تاریخ، لڑکے کی مائیاں، لڑکی کی مہندی، جوڑے کی رسم، گھڑولی بھرنے کی رسم، لڑکے کا ناراض ہو کے کسی کے گھر جانا پھر مطالبات منوا کے آنا، بارات اور سہرابندی، نکاح، رخصتی، ولیمہ، مکلاوہ یا تیسرے کی رسم، ھینک بھرنے کی رسمیں، پہلی عید، پہلی شب رات و دیگر مواقع یا دلہن کا میکے آنا جانا، پہلی دفعہ ماں بننے پر رسم و رواج۔ پہلے بچے کے نام پہ اختلاف رائے و دیگر رسم و رواج۔ یہ بہت تفصیل سے لکھا جا سکتا ہے اور یہ خاتون سے اچھا کوئی نہیں لکھ سکتا۔

دولھے کو گھوڑے پر بٹھانے کی رسم

بارات والے دن سہرا باندھنے کے بعد روانگی بارات سے قبل دعا کی جاتی ہے کہ یہ شادی خیر خیریت سے گزر جائے۔ اس کے بعد شادی والے لڑکے کو جسے (معراج) کہتے ہیں گھوڑے پر بٹھاتے ہیں کیونکہ ان تنگ گلیوں میں گاڑی پر نہیں جایا جا سکتا۔ دوسرا یہ شادی پر شاید شاہی رسم ہوتی ہوگی کہ دور سے پتا چل جائے گھوڑے پر بیٹھا شخص دولھا ہے بلکہ شاید اس وقت تو ساری بارات گھوڑوں پر جاتی ہوگی مگر آج کل کیونکہ مہنگائی کا زمانہ ہے اور گھوڑا کرایہ پر لانا پڑتا ہے۔ اس لیے لوگ ایک ہی گھوڑے پر اکتفا کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے انڈین فلموں میں گانا گایا گیا ہے:

؎ تینوں گھوڑی کنے چڑھایا بھوتنی دیا۔

دولھا باقاعدہ سے گھوڑے پر بیٹھا رہتا ہے جب کہ اس کے دوست احباب نوٹوں سے بدھائیاں دیتے ہوئے ساتھ شامل ہوتے ہیں اور بینڈ باجے والے آگے آگے

ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جس بارات میں بینڈ باجے اور دولہا گھوڑی پر نہ بیٹھ کر آئے وہ بارات نہیں کہلاتی اور یوں لگتا ہے جیسے فوتگی پر لوگ جا رہے ہیں۔ راستے میں گھوڑی کے ساتھ ساتھ سارے لوگ ان گلی محلوں میں پیدل چلتے ہوئے جاتے ہیں اور اکثر بارات میں پتاشے اور مکھانے (میٹھے سے بنی ہوئی چپٹی اور گول گولیاں) اس گھوڑی اور بارات میں لوگوں پر لٹائے جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے پہل پانچ پیسے، دس پیسے، چار آنے اور آٹھ آنے کے سکے بارات پر لٹائے جاتے تھے جو بچے اٹھا لیتے تھے۔ گلی محلوں میں گھما کر اس بارات کو لڑکی کے گھر لے جانے سے قبل کسی مزار پر اپنے علاقے میں لے جایا جاتا تھا اور جو دولھا ایسا نہ کرتا کہتے تھے کہ شادی کامیاب نہیں ہوگی۔ البتہ اب تعلیم اور میڈیا نے لوگوں میں شعور کرنا شروع کر دیا ہے جبکہ اب دولت کی آمد نے بھی کام کر دیکھایا ہے اور اگر اپنی کار نہ بھی ہو تو بھی رینٹ اے کار سے گاڑی لے کر پھولوں والوں سے اُسے سجایا جاتا ہے اسی طرح اب کچھ لوگوں نے گھوڑوں کی بگھیاں بنالیں ہیں، وہ بھی کرایہ پر مل جاتی ہیں۔

مذہبی وثقافتی تہوار

سیاسی لوگ عموماً مذہبی تہوار کو مناتے ہوئے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ جہاں زیادہ تعداد میں لوگ جمع ہوں وہاں جایا جائے اور رات کے خبرنامے یا کم از کم کل کی اخبار میں نمایاں جگہ پر تصویر ضرور آئے۔اس طرح کوئی بھی تہوار چاہے مذہبی ہو یا ثقافتی وہ ہمارے ہاں ضرور منایا جاتا ہے۔ میں شب برات اور شب معراج سے شروع کروں گی۔ عام طور پر ان دونوں مذہبی تہواروں کی بہت اہمیت بتائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں انھیں بڑے اچھے انداز سے منایا جاتا ہے۔ پوری رات تلاوت اور نوافل ادا کیے جاتے ہیں۔ مغرب کی اذان سے قبل سوجی کا حلوہ، سویاں، میٹھے چاول یا کھیر بنا کے پورے محلے میں بانٹے جاتے ہیں اور جس گھر میں دیئے جائیں وہ بھی آگے سے کچھ نہ کچھ ڈال کے پلیٹ واپس کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ اپنے پیاروں اور پیغمبروں کے لیے ایصال ثواب کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکیاں نئی نویلی دلہنیں اپنے اپنے میکے آتی ہیں۔ منگنی والی لڑکیوں کے لیے سسرالیوں کی طرف سے بھی کھانا کچا یا پکا ہوا آتا ہے۔

شب برات پر ہم موم بتیاں جلاتے ہیں یا چراغاں کرتے ہیں اور بچے خوب پٹاخے چلاتے ہیں۔ پورے محلے میں پوری رات ڈز ڈز کی آوازیں گونجتی ہیں جس کے خلاف مولوی صاحب خطبے بھی دیتے ہیں کہ یہ ہندوؤں کی رسمیں ہیں مگر بچے کہاں ان کی بات سنتے ہیں۔ مولوی صاحب بھی پوری رات مسجد میں عبادت کرتے ہیں اور کرواتے ہیں۔ بریلوی مسلک کی مساجد میں نعت اور درود شریف کا بھی ورد پوری رات رہتا ہے البتہ شیعہ اس موقع پر خاموش رہتے ہیں۔ نہ حمایت، نہ مخالفت کرتے ہیں۔

شب برات کے پندرہ دن بعدرمضان کی آمد شروع ہوجاتی ہے اور ہرکوئی رمضان کوبھرپورطریقے سے مناتا ہے۔ باقاعدہ سے مسجداورافطاری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اکثر گھروں میں فروٹ، پکوڑے، سموسے، کھجور، چاٹ اور مشروبات وغیرہ سے افطاری ہوتی ہےاور پھرکھانا نماز کے بعدکھاتے ہیں۔ پورادن رمضان میں تندوراور ہوٹل بندرہتے ہیں۔صرف سحری اورافطاری کے وقت کھلتے ہیں۔عموماً دودھ دہی والے بھی عصر کے بعد افطاری کے لیے دوکان کھولتے ہیں البتہ روزے ہرکوئی نہیں رکھتا۔خصوصاً گرمیوں میں تو تمام نوجوان لڑکےسحری کر کےبھی روزہ کھالیتے ہیں لیکن سرعام یا گھر والوں کےسامنےنہیں چوری چھپے کھاتے پیتے ہیں۔ افطاری کے موقع پر پھرموجود ہوتے ہیں۔ بچوں میں بھی روزوں کا بہت رجحان ہے۔ پانچ سال کی لڑکیاں سات سال کےلڑکے روزے بڑے شوق سے رکھتے ہیں اور پہلا روزہ رکھنے پرگھر والوں سے تحائف وصول کرتے ہیں۔ ۲۷۔ رمضان کولیلۃ القدر کی محفل اوراگلے تین دن کومحفل شبینہ تمام مساجد میں کی جاتی ہے۔ختم قرآن پرہرگھرمیں دل کھول کرخیرات تقسیم ہوتی ہے۔ پوری رات عبادت میں گزاری جاتی ہے۔عام طور پرگاؤں والےلوگ رات کو چاول اور دہی بھی محلے میں بانٹتے ہیں۔ ورنہ ختم قرآن کے بعد فروٹ، کھجور یا چاول حیثیت کے مطابق محلے میں تقسیم ہوتے ہیں اور بیسویں روزے سے اعتکاف کا سلسلہ بھی شروع ہوتا ہے۔اعتکاف کے دوران خواتین گھروں میں،مرد مساجد میں بیٹھتے ہیں جنھیں ثواب کی خاطر محلے والے بڑےاحترام سے روزانہ افطاری اورسحری بھیجتے ہیں۔ ویسے بھی مساجد میں بڑی افطاریوں کا اہتمام کروایا جاتا ہے۔ یوں تو رمضان کے پورے مہینہ میں خریدوفروخت ہوتی ہے کیونکہ ہرگھر میں پھل ضرور لایا جاتا ہے لیکن آخری تین روزوں میں بازاروں اور تمام جگہوں پر رش بڑھ جاتا ہے۔ ہرغریب امیرخریداری کرتا ہے۔ ویسے امیروں کی تو روزعید ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں

صرف سال میں دو دفعہ ہی عید آتی ہے۔اس موقع پر چاہے ادھار کریں یا نقد بچوں کو نئے کپڑے جوتے ، چوڑیاں، مہندی دلوانا پڑتی ہے۔ چاند رات بہت اہم ہوتی ہے۔ پہلے صرف پی ٹی وی تھا وہ بھی آدھی رات کو چاند آنے یا نہ آنے کی خبر دیتا تھا۔اب تو بہت سے چینل ہیں۔ ملک بھر میں کہیں نہ کہیں سے چاند نکال ہی لیتے ہیں اور اس کا اعلان سنتے ہی لوگ گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ بچوں کے ہمراہ تمام قریب کی مارکیٹوں اور دور کے بازاروں کی طرف جا کر عید کے لیے خریداری کی جاتی ہے۔ پہننے کے علاوہ کھانے پینے کے لیے بھی خصوصاً مٹھائی، پھینیاں، چاٹ ، مرغی، گوشت، مصالحے اور فروٹ ہر طرح کی چیزیں مہنگے یا سستے داموں ہر حال میں لانا پڑتی ہیں۔اب عید کی صبح صبح پانچ بجے ہی مولوی صاحب صبح کی نماز کے بعد عید کی نماز کا اعلان فرما دیتے ہیں۔ پورا مہینہ انھوں نے نماز تراویح پڑھائی ہوتی ہے۔ چار خطبے جمعے کے دیتے ہوئے رمضان المبارک کی مناسبت سے اب ان کا بھی حق ہوتا ہے کہ عید کی نماز پڑھا کے عیدی وصول کریں۔ وہ آخری روزے کو ہی فطرانے کی رقم کا اعلان کر دیتے ہیں اور عید کی صبح مسجد کے سپیکر میں اعلانات کرتے رہتے ہیں کہ فطرانہ مسجد میں دیں۔ ہمارے والدین یہ فطرانہ چاند رات کو محلے کے کسی غریب فیملی کی خاتون کو بھجوا دیتے ہیں۔ مسجد میں پتا نہیں کوئی دیتا ہے یا نہیں۔البتہ عیدی تو ضرور دس سے سو روپے تک مسجد کے ڈبے میں ڈالنی پڑتی ہے لیکن جہاں مدرسہ ہے وہاں لازمی فطرانہ دیا جاتا ہے۔

صبح صبح عید کی نماز کے بعد محلے والے مسجد میں ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ پھر گھروں کی طرف جا کر بڑے بوڑھوں سے ملتے ہیں۔ سب چھوٹے بڑے اپنے بڑوں سے ملتے ہیں۔ پورے سال کے گلے شکوے ہر عید کے موقع پر معافی مانگ کر ختم ہو جاتے ہیں۔عید ملنے آنے والوں کی خاطر تواضع چائے، مٹھائی اور دوسری پکی ہوئی

چیزوں سے کی جاتی ہے۔ شیر خورمہ عام طور پر ہر گھر میں بنتا ہے اور کھیر بھی--- ہر آنے والے مہمان کے ذوق کے مطابق کھلایا جاتا ہے اور وہ بھی جاتے وقت گھر کے بچوں کو عیدی چاہے دس روپے ہو یا سو روپے دے کر جاتا ہے اس کے علاوہ تمام لڑکیاں عید کے موقع پر مہندی لگواتی ہیں۔ گلی محلے میں بیوٹی پارلر عام ہوگئے ہیں جو بیس روپے آنکھوں کو سجانے کے لیتے ہیں-/150 روپے میں منہ کا حال درست کر دیتے ہیں۔ فیشل اور پلکنگ کر کے بھلے دیسی کریمیں ہی کیوں نہ استعمال کریں وہاں پہ رات دو بجے تک رش رہتا ہے۔ پورے سال میں جس کا بزنس نہیں چلا ہوتا خسارہ عید کے موقع پر نکال لیتے ہیں۔ تمام شادی شدہ خواتین اپنے بچوں کے ہمراہ والدین کے گھروں میں دور دراز سے عید منانے آتی ہیں۔

نقدی کے علاوہ کپڑے جوتے، چوڑیاں، مہندی بھی تحفے میں دینے کا رواج ہے۔ عید کے موقع پر خصوصاً جن لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی منگنی کے بعد سسرال والے اس کے لیے با قاعدہ کپڑے، جوڑے کے علاوہ چاول سویاں میک اَپ تک لاتے ہیں اور شادی کے بعد ماں باپ کی طرف سے بھائی لڑکی کے گھر عید پر اسی طرح سامان دے کر آتا ہے۔

ان رسموں سے رشتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ دوسرے دن بھی اسی طرح مہمانوں کا سلسلہ چلتا رہتا ہے وہ لوگ ان کے گھر جاتے ہیں جو پہلے دن ان کے گھر آئے تھے۔ بچے تو گلی محلوں میں لگے جھولے جھولتے ہیں۔ چاٹ والے سے چاٹ کھاتے ہیں۔ غبارے لیتے ہیں، مہندی لگواتے ہیں اور سارا دن دوکانوں پر عیدی خرچ کرتے ہیں۔ بڑے دوسرے یا تیسرے دن انھیں گھمانے پھرانے کسی پارک کا بھی چکر لگا لیتے ہیں۔ وہ لڑکیاں جن کے ماں باپ دوسرے شہروں میں ہیں وہ ان علاقوں سے چاند رات کو ہی نکل جاتی ہیں جنھیں عموماً میکے سے کوئی لینے آتا ہے۔ عید ختم ہونے کے بعد سب آہستہ آہستہ واپس عام کی زندگی کی طرف آتے ہیں۔

واپسی کام کاج شروع ہوتا ہے اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس طرح دو ماہ گزر جاتے ہیں اور ذوالحج کا چاند نظر آ جاتا ہے۔ ان علاقوں سے بہت سے لوگ نقد ادھار کمیٹیاں ڈال کے مکان بیچ کے، یہ دیکھے بغیر کہ کمائی حلال کی ہے یا حرام کی، وہ گناہ بخشانے کی نیت سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد قلیل ہے کیونکہ حج کے اخراجات اس قدر زیادہ ہوگئے ہیں کہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ خصوصاً رزق حلال کمانے والوں کے لیے تو یہ ناممکن ہے البتہ حج یا عمرہ پر جانے والوں کو بڑے جوش وخروش سے الوداع کیا جاتا ہے۔ ان کو بھی گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں۔ اس کے گھر والے روانگی پر ختم پڑھاتے ہیں اور پھر آمد پر لوگ مبارک باد کے لیے باقاعدہ سے آتے ہیں۔ مٹھائی پھولوں کے ہار اور نوٹوں کے ہار کے علاوہ کپڑے وغیرہ بھی لاتے ہیں اور حج سے سے آنے والے ان کے لیے جائے نماز، کھجور، آب زم زم چھوٹے چھوٹے گفٹ چین کی بنی ہوئی تسبیح اور ٹوپیاں بھی دیتے ہیں۔ حج کے دن بھی عام طور پر پورے محلے میں دعا کی جاتی ہے۔ گھروں میں حلوہ اور میٹھی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ دوسرے دن بڑی عید (عیدالضحیٰ) آ جاتی ہے۔ اس دن سے قبل اور تین دن تک یہ لوگ قربانی کی رسم جو ابراہیم علیہ السلام کے دور سے شروع ہوئی اس کو بڑی عقیدت سے آج تک برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ وقت اور مہنگائی کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں بکروں کی قربانی بہت کم ہوگئی ہے کیونکہ ان کی قیمت زیادہ ہے اور ایک بکرا یا دنبہ ایک شخص دے سکتا ہے، اس میں دوسرے کا حصّہ نہیں ہوتا ہے جبکہ گائے، بیل، اونٹ میں سات لوگوں کا حصّہ ہوتا ہے۔ اس لیے اب ہر میدان پلاٹ میں گلیوں میں گائے، بھینس اور اونٹ کی بھی قربانی کی جاتی ہے۔ اکثر گھر چھوٹے ہونے کی وجہ سے کھلی جگہوں پہ کچی زمین کھود کے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اس کا خون دفن کر دیا جاتا ہے۔ اس کی کھال کے لیے مساجد، مدارس خصوصاً مذہبی اور فلاحی

اداروں کے کارکنوں میں جھگڑا رہتا ہے کہ کون لے کر جائے گا۔ البتہ اس کے جسم کے باقی حصّے پائے ٹکڑے کر کے یا ثابت بھی جس کے زیادہ حصے ہوں ان کو دے دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر فیملی والے بہن بھائی اپنے حصّے ڈال کے ہی قربانی کرتے ہیں۔ پھر سنت کے طریقہ سے تین حصے کر لیے جاتے ہیں اور گوشت کا ایک حصہ اپنے محلے کے غریبوں ایک رشتہ داروں اور ایک اپنے لیے رکھ لیا جاتا ہے۔

تین دن تک قربانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے عام طور پر اوجھڑی محلوں میں کھلی پھینک دی جاتی ہے جسے جمعدار اور دوسرے کاغذ اور لکڑیاں چننے والے اٹھا کے لے جاتے ہیں اب اوجڑی بھی کار آمد ہوگئی ہے اس سے شاید مرغیوں کی خوراک بنائی جاتی ہے۔ اس لیے آہستہ آہستہ اب اوجڑی وبال جان نہیں رہی ہے۔

عیدالاضحیٰ کے بعد دوسرے دو ماہ صفر اور محرم بہت اہم ہوتے ہیں۔ یہ اہل تشیع حضرات کے لیے زیادہ اہم مہینے ہیں۔ چونکہ ہمارے ان تمام علاقوں میں شیعہ حضرات بہت اکثریت سے ہیں امام بارگاہیں بھی ہیں اور محرم کے آغاز سے ہی ان علاقوں میں ان کے گھروں میں ماتمی مجالس کا آغاز شروع ہوجاتا ہے اور امام عالی مقام کے لیے نذر نیاز بھی دی جاتی ہے۔ محرم کے دس دنوں میں یہ خوشی نہیں مناتے ہیں بلکہ سنی بھی خوشی کی تقریبات سے دور رہتے ہیں اور بھائی چارہ کی فضا پیدا کی جاتی ہے۔ یہاں پر کبھی مذہبی تنازعہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ شیعہ پورا محرم اور صفر سوگ میں مناتے ہیں۔ علم اور جلوس، مجالس نیاز کا اہتمام ہوتا ہے اور ماتم کیا جاتا ہے اور دو مہینوں تک ان علاقوں میں چھوٹے بڑے جلوس نکالے جاتے ہیں جن کی ترتیب ان لوگوں نے خود دی ہوتی ہے اور باری باری شہر کے مختلف علاقوں سے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ بیس صفر کو چالیسویں کے لیے بھی اسی طرح کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔

چُوری روزہ صفر کے مہینے میں آخری بدھ کو منایا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ روزہ کھولتے ہیں اور کوئی لوگ گھروں میں آٹا شکر گھی اور خشک میوہ جات ڈال کے چوری بناتے ہیں جو پورے محلے میں بانٹی جاتی ہے۔

ربیع الاوّل کے مہینے میں حضورؐ کا یوم پیدائش ۱۲۔ ربیع الاول کو منایا جاتا ہے اور تمام اہل سنت والجماعت کے لوگ بڑے بڑے جلوس نعت کی محفلوں اور میلاد کا اہتمام کرتے ہیں جس کے لیے یکم تاریخ سے لڑکے ٹوپیاں پہن کے بڑی سڑکوں پر بینر اور رسی پکڑ کے گاڑیوں کو روک کے کھڑے ہوجاتے ہیں اور چندہ اکٹھا کرتے ہیں جو بہت کم اس مقصد کے لیے خرچ ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے کھانے پینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے صاحب حیثیت لوگوں سے بھی چندہ لیتے ہیں کہ جلوس کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لوگ عام طور پر گلی محلوں میں بینرز اور وال چاکنگ بھی کرتے ہیں جس پہ **''خوشی ہے آمنہ کے لال کے آنے کی''** لکھا ہوتا ہے۔ پھر بعض علاقوں پر سڑک کے کنارے بتیاں لگائی جاتی ہیں اور کچھ سٹال لگائے جاتے ہیں۔ کھانا پکانا بھی جاری رہتا ہے۔

علاج معالجے کی سہولیات اور طریقہ کار

انشورنس کمپنیوں کی بدولت بیرون ممالک میں لوگ علاج معالجے کی سہولیات حاصل کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی امیر طبقہ اپنی طاقت کے مطابق صحت حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہماری ان آبادیوں میں عام طور پر ٹونے ٹوٹکے، دم درود، مزاروں پہ جانا۔ علاقے میں موجود نیم حکیم، ڈاکٹر سے علاج کروانے کے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ بیماریوں کی صحیح طرح سے تشخیص کرواسکتے ہیں۔

آج سے کئی سال قبل ڈاکٹر ناپید ہوتے تھے صرف ایک ڈاکٹر صاحب ہوتے تھے جو خاندانی سید تھے اوران کے والد گھر کی بیٹھک میں دم درود سے لوگوں کا علاج کرتے تھے مگر ان کے بیٹے نے بہت تعلیم حاصل کر لی اور دس جماعتیں پڑھ لیں تو انھیں شرم محسوس ہونے لگی کہ دم درود کے ورثے کو اپناتے ہوئے اس نے کوٹ پہن لیا گلے میں سٹیتھوسکوپ لگا لیا اور میڈیکل سٹور سے کچھ علم اور دوائیاں حاصل کر کے ایک چار فٹ کے کمرے میں شیشہ لگا کے بیٹھ گیا اور ڈاکٹر کے نام سے جلد ہی مشہور ہو گیا۔ اس وقت جو ٹوٹی لگا کے (سٹیتھ) چیک کرے اور تھرمامیٹر پر بخار پڑھ کے بتا سکے وہ ڈاکٹر سمجھا جاتا تھا اس لیے وہ بھی ڈاکٹر بن گیا۔ رہی بات تجربہ کی تو اس نے علاقے کے غریب لوگوں پر مختلف گولیاں اور شربت بدل بدل کے وہ بھی حاصل کر لیا۔ کسی کو فرق پڑ جاتا ہے کسی کو نہیں۔ آج اس کے بیٹے نے اس کلینک کو تیس سال بعد بھی قائم رکھا ہے۔ صرف ہومیو پیتھک کا یا حکیم کا شاید کورس کر لیا ہے۔ ان کے باپ دادا بے اولاد خواتین و حضرات کو تعویز دیتے تھے۔ یہ لوگ گولیاں دیتے ہیں۔ لوگ ان پر یقین رکھتے ہیں تو وقت کے ساتھ بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

وہ بھی اللہ کی مدد سے کہ اسی دوایوں سے البتہ تین نسلوں کا تجربہ ہو گیا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ وہ اکثر دوائی نہیں دیتے تھے مگر مریض جب آتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کو بتا دیتے کہ کل تو پیٹ درد اور بخار کی گولیاں ختم ہو گئی تھیں میں نے تمھیں چاول پیس کے پڑیاں بنا دیں تھیں اور دیکھو میرے ہاتھ میں شفا ہے اور تمھارا میرے پر یقین اس لیے ہے کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو اور زیادہ مریضوں کو کمزوری کی دوائی دودھ کے ساتھ کھانے اور پھل کھانے کا مشورہ دیتے تو ظاہر سی بات ہے دودھ اور پھل سے تو ویسے بھی کمزوری ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کا علاج معالجہ ہمارے ہاں تو ماڈرن لوگ کرتے تھے۔ جو غریب اور انجان لوگ ہوتے ہیں جاہل کہنا مناسب نہیں سمجھتی۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ البتہ زیادہ لوگ ان بیماریوں کے لیے الگ الگ مزاروں پر اور دم درود کے لیے جاتے ہیں اور تعویز دھاگہ کرواتے ہیں کبھی یرقان کا علاج دور کسی دوسری ڈھوک میں بیٹھی خاتون یا بزرگ مرد سے تیل دم کروانے سے کرتے ہیں اور کسی درخت کی ٹہنیاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر دھاگے میں پرو کے گٹ (تعویز) بنا کے دیتے ہیں اور اس عمل کو تین یا پانچ اتوار کو لازمی دہرانا پڑتا ہے۔ وہ جو طریقہ کار کرتے ہیں اتنا ہی علاج میں وقت درکار ہوتا ہے جو یرقان کے سرکل کا ہوتا ہے ٹھیک ہونے پر لوگ اس سے محض دس، بیس، پچاس روپے میں اپنا یرقان بظاہر ٹھیک کروا لیتے ہیں۔ اگر اس کے ٹیسٹ کروائیں تو ہاپٹیٹس کی کوئی نہ کوئی قسم نکل آئے گی۔ وہ اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کی کسی نہ کسی بیماری کے لیے مخصوص مزار ہوتے ہیں میاں بابا پر دردوں کے علاج کے لیے جاتے ہیں تیل مزار کے چراغوں سے لے کر لگانے سے بچوں کے کیا بڑوں کے جوڑوں کا درد اس سے ٹھیک کیا جاتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے جب تیل چراغ میں کافی دیر تک گرم ہوتا ہے اس کو لگانے سے مساج کرنے سے آرام تو ملے گا۔ اس کے علاوہ بچے کا بڑا

بخار ٹائیفائڈ معصوم شاہ کی زیارت پر جانے سے اور جھنڈے پر گرہ لگانے سے ٹھیک کرواتے ہیں۔ ٹینوں والے بابے پہ عام بخار اور چھیڑ کرنے والے بچے اور بڑے جاتے ہیں اور اس میں بھی شیعہ سنی کے الگ الگ مزار پر الگ الگ علاج کروائے جاتے ہیں۔ شاہ چن چراغ جو کئی سو سال قدیم ہے وہاں پر بچیوں کے علاج کے ساتھ ساتھ ان کی شادیوں کے لیے منت بھی مانی جاتی ہے اور خاص طور پر کمزور بچے جنھیں پیدائشی طور پر کمزوری ہوتی ہے اسے پچھاوے کی بیماری کہتے ہیں اس کے لیے چوہڑ والے شاہ پیارے کی زیارت پر سات اتوار لے کر جایا جاتا ہے کئی سالوں سے اس بات کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں کہ میری بڑی بہن جو ۳۵ سال کی ہے اسے میری والدہ سات اتوار بچپن میں دو سال کی عمر میں لے گئی تھی پھر اس کی بیٹی کو میری بہن دو سال کی عمر میں لے کر جاتی رہی تھی اور وہاں سے آنے کے بعد ہر اتوار کو ترازو میں ایک طرف پرانی جوتیاں رکھ کے دوسری طرف بچے کو رکھ کے تولتے ہیں اور سات اتوار یعنی ۴۹ دنوں میں ظاہر سی بات ہے بچے کے وزن میں کچھ نہ کچھ تو فرق پڑ ہی جاتا ہے۔ ہر اتوار کو وہی جوتے رکھے جاتے ہیں اور جوتوں کی تعداد میں اضافے سے اس بچے کی صحت بہتر ہونے کے معیار کا اندازہ لگایا جاتا رہتا ہے۔

اسی طرح تعویز دھاگے کے لیے کسی بڑی شاہراہ یا ہر جگہ میں ایک آدھ شاہ صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں جو بیماریوں کے ساتھ ساتھ کاروبار جن بھوت اور ہر قسم کے مسائل کے حل کے لیے تعویز دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں معاوضہ عام طور پر نقد، دودھ، زعفران، تیل وغیرہ کی صورت میں حاصل کرتے ہیں اسی طرح ہر مزار پر بھی اپنی منتیں اور چڑھاوے علاجوں کے لیے دیے جاتے ہیں جب بجلی نہ ہوتی تھی تو چراغ میں تیل ڈال کے علاج کروایا جاتا تھا یا ٹھیک ہونے کی صورت میں فیس/ معاوضے کے طور پر سوا روپے سے گیارہ روپے تک کا تیل ڈالا جاتا تھا۔ بجلی کا بل ادا کرنے کے لیے۔ اَب اتنے

ہی پیسے نقد ڈبے میں ڈالے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ ذرا بہتر لوگ جو کئی سالوں سے اولاد کے لیے ترستے ہیں جن کی بچیاں شادی نہ ہونے کی وجہ سے مرگی اور ہسٹریا کے دورے میں مبتلا ہوتی ہیں اور اسے جن یا بھوت کا سایہ کہتے ہیں اس کے علاوہ ملک سے باہر جانے کے کاروبار میں بہتری کے لیے اور بڑے علاج معالجے کے لیے بڑے اسپشلسٹ قریب ترین کے مزارات ہیں جہاں لوگ جاتے ہیں بے اولاد لوگ بڑی درگاہ کے مزار پر جا کر دیگ مان کے علاج کرواتے ہیں جبکہ جنوں بھوتوں،معدے،گردے کے مریض مقامی درگاہوں پر جا کر جمعرات جمعہ کو تعویز،دم اور علاج کرتے ہیں ان مزارات سے مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے دم کی گئی اجوائن اور کھانے کے علاوہ نمک بھی خردے کے طور پر لایا جاتا ہے جس سے بیماروں کا علاج ہو جاتا ہے۔پھر معاوضے کے طور پر ان مزارات پر بکرے،نقد اور دیگیں بھی چڑھاتے ہیں۔ہر بیماری کی نوبت پہ منت مانی جاتی ہے۔

بچوں اور بڑوں کے لیے دم درود تعویز اور مزارات کے علاوہ بھی ماہرین علاج بیٹھے ہوتے ہیں جو نہ تو ڈاکٹر ہیں نہ ہی کوئی روحانی پیشوا۔وہ ٹیکنیکل پرسن ہوتے ہیں کسی بچے کا گلا خراب ہو گیا اسے کنڈی ہے جس کی وجہ سے اس کا پیٹ خراب بھی ہو جاتا ہے۔الٹی اور جلاب لگ جاتے ہیں ایسا عام طور پر کسی سے بچھڑنے کی صورت میں اس کی کمی سے ہوتا ہے۔اس کے لیے دم والے بابے کے پاس لے جاتے ہیں جو دم کی بجائے تیل سے اس کا گلا بازو اور ٹانگیں ملتا ہے۔اس کے علاوہ سر درد اور پٹھوں کے درد میں بھی وہ بابا (ہزاروی) کندھوں کی مالش یا اکسرسائز کروا کے پٹھا اترا ہوا چڑھا دیتا ہے اس سے سر درد بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اس کے علاوہ عام طور پر ناف کا درد کسی کو بھی کوئی وزن اٹھانے سے پیٹ میں ہو جاتا ہے اس کا بھی علاج درد کے بغیر صبح خالی پیٹ تیل سے مالش کر کے اور کپڑے کا گولا سا بنا کے ناف کے نیچے پیٹ پر رکھ کے اس پر الٹا لٹا کے دبا کر کیا جاتا ہے۔بندہ اس عمل

سے دو دن میں شرطیہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بابا جی خود تو کچھ نہیں مانگتے مگر اکثر لوگوں سے تیل لے لیتے ہیں ایک آدھ پاؤ یا اس کے برابر رقم جو کبھی سوا روپے تھی اب پچاس روپے ہو گئی ہے اور کوئی اسپشلسٹ ڈاکٹر اتنے تھوڑے پیسوں میں علاج تو دور کی بات آپ سے ملے گا بھی نہیں۔

اس کے علاوہ بھی ماہرین ہیں جو کسی بھی باز و ٹانگ پاؤں، گردن کی ہڈی ٹوٹنے یا اترنے کی صورت میں نہ صرف اسے چڑھاتے ہیں بلکہ ڈاکٹر سے اچھا پلستر لکڑی کی پھٹیاں رکھ کے باندھ بھی دیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اب جدید سائنس کی بدولت ایکسرے لے کر یہ عمل کرتے ہیں انھیں پہلوان یا ہڈی جوڑنے والے کہتے ہیں۔ وہ باقاعدہ ہر ہڈی کی الگ فیس بتاتے ہیں اور لیتے ہیں۔اس کے لیے مالش کی دوائی، قسم قسم کے تیل، ٹکور کرنے کے لیے چیزیں دیتے ہیں لیکن یہ بھی کسی ماہر ڈاکٹر سے کئی گنا کم معاوضہ لیتے ہیں اور لوگ کئی کئی دن ان سے پٹیاں کرواتے ہیں اور تجربہ کار پہلوان یا بندہ ڈاکٹر سے کئی گنا کم وقت میں ٹھیک کر دیتا ہے۔مصیبت یہ ہے کہ آج کل نیم حکیم کی طرح بہت سے نیم پہلوان اور ہڈی جوڑ بھی جگہ جگہ دوکانیں سجا کے بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا ان سے علاج کرانے کا رجحان کم ہو رہا ہے۔کہیں کہیں قریب کی پرانی آبادیوں میں یا مین روڈ میں نئ سکیموں کے مکینوں کے لیے ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی بڑے بڑے کلینک لگا کے بیٹھے ہیں اور ہومیو پیتھک والے بھی ایلو پیتھک دوائیاں سجائے بیٹھے ہیں وہ بھی ٹیکہ لازمی لگاتے ہیں کیونکہ عام لوگ ان سے علاج صرف اس شرط پر کرواتے ہیں کہ بڑا سا لال رنگ کا ٹیکہ لگا ئیں تو تب 100 روپے بھی دیں گے وہ فوراً بخار، کھانسی اور درد سے چھٹکارے کے لیے ٹیکوں کی فرمائش کرتے ہیں۔ایک شیشے کی سرنج میں سٹیل کی سوئیاں بدل بدل کے ٹھنڈے پانی میں دھو کر ٹیکہ لگایا جاتا تھا۔اب ڈسپوزایبل سرنج کا رواج تو ہو گیا ہے مگر یہ ڈاکٹر اس

بچت کے لیے ڈسپوزایبل سرنج سے بھی چار پانچ مریض بھگتا ہی لیتے ہیں جس سے درد تو شاید ٹھیک ہو یا نہ ہو انھیں خطرناک بیماریوں میں مبتلا ضرور کر رہے ہیں اور وہ سارے کوئیکس / عطائی ہیں البتہ انھوں نے کسی نہ کسی ہومیو پیتھک ڈاکٹر یا ایم بی بی ایس کا بھی بورڈ لگا رکھا ہے لیکن علاج تو خود ہی کرتے ہیں ڈاکٹر کبھی کبھار آتے ہیں یا ہفتے میں ایک آدھ بار بلا لیتے ہیں۔ جو خود علاج کر رہا ہوتا ہے وہ کیسے ڈاکٹر بنتا ہے یہ ہے ایک مشہور ڈاکٹر جو ہمارا ذاتی دوست بھی ہے اس کی کہانی لکھتی ہوں۔ ایسا ہی سارا عمل کسی نہ کسی طرح دوسرے ڈاکٹروں نے بھی ڈاکٹر بننے کے لیے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جو آج تین منزلہ عمارت میں اپنا پورا ہسپتال چلا رہے ہیں ان کا میڈیکل سٹور اور چھوٹی سی لیبارٹری بھی ہے کبھی قریب کی پرانی اور پوش آبادی میں ایک ڈاکٹر جو مجھے نہیں پتا ایم بی بی ایس تھا یا نہیں البتہ کلینک اُس کا بہت بڑا تھا اس کے پاس زیر تعلیم ہوتے ہوئے کام سیکھنے گئے۔ ایک سال لگا کے کام سیکھا جو اس وقت پانچ دس روپے روزانہ کے اسے دے دیتا تھا اور بارہ گھنٹے صبح 00-8 بجے سے رات 00-8 بجے تک کلینک میں کام کرواتا تھا۔ کام سیکھتے ہوئے میٹرک کا رزلٹ آ گیا اور اس میں سپلی آنے کی وجہ سے کام چھوڑنا پڑ گیا تو ڈاکٹر صاحب نے چھٹی دینے کی بجائے نوکری سے نکال دیا تو انھیں غصہ آ گیا۔ میٹرک پاس کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے قریب کی غریب آبادی میں کسی نکڑ پر چھوٹی سی بیٹھک میں کلینک شروع کیا اور محلے کے لوگوں خصوصاً خواتین سے دوستیاں اور رشتہ داریاں بنانے لگے۔ چار پانچ سال تک دس روپے میں لوگوں کو دوائی دیتے رہے۔ نوجوان ہونے کی وجہ سے بہت سی خواتین ان کی مریض بن گئیں جسے ان کے خلاف ہتھیار بنا کے مخالف ڈاکٹر نے سوال اٹھایا کیا کہ وہ نامحرم ہے اور خواتین کو کس کس طرح سے چیک کرتا ہے۔ یہ غلط ہے مرد مریض زیادہ تر اس کے پاس نہ آتے تھے مگر خواتین گھروں سے چوری چھپے اس کے پاس علاج کے لیے جانے

لگیں اور وہ کئی خواتین کے گھروں میں بھی جانے لگا۔ یہ بھی اس کے خلاف پراپیگنڈہ کیا جانے لگا کیونکہ وہ مریضوں کے بلانے پر گھر میں بھی جا کر اسی فیس میں چیک کرتا تھا جو مخالف ڈاکٹر صاحب نہ کرتے تھے۔ وہ مشہور ہونے لگا اور کہتے ہیں کہ بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا جو اہم بات تھی اس کے طریقہ علاج میں وہ انجکشن کا بے دریغ، بے جا استعمال۔ ہر بیماری چھوٹی ہو یا بڑی دو، دو انجکشن ایک لال ایک سفید یا پیلا ہر کسی کو B.complex یا Nerobian کا لگانے لگا۔ اب پڑیوں کی جگہ پتے والی گولیاں لکھ کے دینے لگا اور کیپسول بھی اس کے علاوہ۔ اس نے ساتھ ایک عدد نرس رکھ لی جو میل مریضوں سے بڑی ہنس کھیل کے بات کرتی اور وہ خوشی سے ٹیکہ اس سے لگوانے لگے۔ اس طرح مرد مریضوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ نہ صرف ٹیکہ پہ اکتفا کیا۔ ہر مریض کو بٹھا کے ڈرپ گلوکوز جس میں وہ پانچ چھ ٹیکے لوگوں کے سامنے ہر بیماری چاہے بخار ہو، یرقان، الٹی، جلاب ہر مسئلے کے لیے الگ الگ ٹیکے ڈالتا تھا اور مریض دو تین گھنٹے اس کے کلینک میں لیٹے رہتے جس سے اسے مریضوں کے سامنے سوشلائزیشن کا وقت ملنے لگا۔ آدھی بیماری تو مریض کی صاحب اور ان کی نرس سے بات کر کے دور ہونے لگی اور وہ ڈبل تو کیا چار گنا دام بھی وصول کرنے لگا۔ اس کے علاوہ وہ چھوٹی سی بیٹھک سے بڑے کمرے میں بھی منتقل ہو گیا اور ساتھ ہی ایک دو کمرے اور باتھ روم والا مکان ڈھونڈا جس میں اس کی نرس نے وہیں ہی غیر قانونی آبارشن کا سلسلہ شروع کر لیا۔ بہت سے سفید پوش غریب لوگ جن کی بچیاں بغیر شادی کے ماں بن رہی تھیں وہ ان کی عزت بچانے لگے۔ بھلے وہ بچی بچے یا نہ بچے۔ ماں باپ کی عزت بچے کو ضائع کر کے بچ جاتی۔ یہ بھی اس کے خلاف مشہور ہو گیا مگر اس سے اس کی شہرت مزید بڑھی۔ ہر مجبور شخص یا عورت اس کے پاس جانے لگا۔ اندھیرے کے علاوہ اب روشنی میں بھی یہ کام ہونے لگا جس سے اس کی آمدن کے ساتھ شہرت بھی

بڑھی۔ اس کے علاوہ اس نے شاید لوگوں کو ایسے انجکشن لگانے شروع کر دیے جن کے وہ عادی ہو گئے اور اس کے علاوہ انھیں کسی اور سے آرام نہ آتا خاص طور پر چرسی اور ہیروئن کے علاوہ سگریٹ نوش بھی تیزی سے اس سے انجکشن لگوانے لگے۔ اب وہ بڑا ڈاکٹر بن گیا۔ اس نے بھی تجربہ اسی علاقے کے غریب اور جاہل مریضوں پہ حاصل کر لیا۔ میٹرک کے بعد میڈیکل سٹور چلانے کے لیے کورس کر کے سٹرٹیفکیٹ لے رکھا تھا اور پورا ہسپتال چلا رہا ہے۔ اکثر انتہائی بیمار مریضوں کو گھر جا کر دیکھتا اور انجکشن لگا دیتا جو تکے کی طرح کبھی لگ جاتا، کبھی مریض پھڑک جاتا۔ کئی مریض بچے اور بوڑھے اس کے ٹیکوں سے فوراً مر گئے جس کی وہ لوگ اس کے خلاف مظاہرہ کرتے اس کے کلینک کے شیشے بھی توڑ دیتے مگر اس نے بہت سوشلائزیشن کر رکھی تھی ہر برادری کے لیڈر، سیاسی ورکر، منتخب کونسلر سب اس کے دوست بن چکے تھے حتیٰ کہ پولیس کے ملازمین کو بھی دوائی دینے لگا۔ اس وجہ سے اس کے خلاف کوئی ایکشن نہ لے سکا۔ اب تو اس کی نرس بھی آدھی نہیں پوری ڈاکٹر بن چکی ہے جو کئی بچوں کو مارنے کے علاوہ خواتین کو بھی موت کی نیند نا تجربہ کاری کی وجہ سے سلا چکی ہو گی مگر بیس سال سے اس نے لوگوں کے دلوں میں بہت جگہ بنا لی ہے۔ اس ڈاکٹر کے پاس اتنا مشہور ہونے کی وجہ سے صحافی بھی آیا اور بھتا مانگنے لگا جس پر ڈاکٹر صاحب نے انکار کر دیا۔ ایک دفعہ ایک لڑکی ابارشن کی وجہ سے بہت خطرناک حالت میں ہاسپٹل پہنچ گئی۔ اس صحافی نے موقع تاڑ کے اخبار میں بڑی سی خبر ڈاکٹر کے خلاف لگا دی جس میں اس کا عطائی اور نا تجربہ کار ہونا بیان کر دیا۔ محکمہ صحت اور پولیس متحرک ہو گئی اس صحافی کو بیس ہزار روپے تو نہ دیے مگر دو لاکھ روپے محکمہ صحت اور پولیس کو دے کر ڈاکٹر صاحب نے اپنا بند کلینک ایک ماہ میں کھلوا لیا اور صرف ایک سائن بورڈ بدل ڈالا بلکہ محکمہ صحت نے خود ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر اسے دیا جو کبھی کبھی آ جاتا ہے مگر باہر بیٹھ کے چائے پیتا اور اخبار پڑھتا ہے اسے ماہانہ چند ہزار روپے

ڈاکٹر صاحب ادا کرتے ہیں۔اس طرح پندرہ سال بعد بھی ڈاکٹر صاحب اپنا کلینک اسی نرس اور اپنی مدد آپ کے تحت چلا رہے ہیں۔ پہلے دس بیس روپے لیتے تھے بغیر انجکشن کے اب 100 روپے لیتے ہیں البتہ ڈاکٹر بننے کے ساتھ ساتھ الحاج بھی ہوگئے ہیں اور اس دوران ان کی نرس نے کلینک کو اس طرح چلایا۔ سننے میں آتا ہے کہ وہ نرس اس کی پچاس فیصد کی پاٹنر ہے جتنے پیسے ہوتے ہیں وہ آدھے اسے دیتا ہے جس کی وجہ سے دونوں نے اپنے اپنے گھر بڑی بڑی آبادیوں میں بنا لیے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب اب واقعی ڈاکٹر بن چکے ہیں۔ایک سرنج ایک ہی دفعہ استعمال کرتے ہیں۔باقاعدہ antibotic چاہے انجکشن ہو یا میڈیسن اس کا کورس مکمل کرواتے ہیں اور کئی میڈیکل ریپ لائن بنا کے ان سے ملاقات کا انتظار کرتے ہیں پھر وہ ان کی تجویز کردہ دوائی اپنے ہی میڈیکل سٹور پہ رکھوا کے لوگوں کو لکھ لکھ کے دیتے ہیں لیکن زیادہ تر اپنے دوستوں کو انجکشن نہیں لگاتے، نہ ہی مشورہ دیتے ہیں۔

یہ ہمارے علاقے میں موجود میڈیکل کی سہولیات اور علاج کا طریقہ کار ہے البتہ جو کیس ان کے بس سے باہر ہو اور کئی دن کی دوائی سے فرق نہ پڑے اسے ہاسپٹل کو reffer کر دیتے ہیں اس وجہ سے کئی لوگ اب بڑے ہاسپٹلز میں جا کر کم از کم ٹیسٹ کروانے لگے ہیں اور کئی NGO کی فیملی پلاننگ سینٹرز بھی گلیوں میں کھل گئے ہیں۔ ریلوے ہاسپٹل ہو یا DHQ اور جنرل ہاسپٹل ہولی فیملی عام طور پر لوگ ان ہاسپٹل میں ایمرجنسی میں اور OPD میں پرچی لے کر پورا پورا دن گزارنے لگے ہیں اور حاملہ عورتوں نے بھی ان ہسپتالوں میں جا کر اپنا چیک اَپ کروانا شروع کیا ہے۔دس پندرہ فیصد تو کیس ڈلیوری بھی ہسپتال میں کروا لیتی ہیں باقی گھروں میں دائیوں سے ہی کرواتی ہیں۔

وفات کے موقع پر رسم ورواج

تھانے دار کی بیوی کی وفات پر سارا شہر حاضر ہوتا ہے۔لیکن تھانے دار کی وفات میں بہت کم لوگ دلچسپی لیتے ہیں۔ امراء میں یہ مختلف ہے۔ لوگوں نے اپنے بچے بیوروکریسی،فوج میں کاروباروں میں فٹ کیے ہوتے ہیں۔ان کی وفات پر ہر طبقۂ فکر حاضر ہوتا ہےاور رنجیدہ ہوتا ہے بلکہ تعزیتی پیغامات کی خبر بھی اخبار میں ہوتی ہےاور کل تک بلکہ بعض اوقات تو چالیسویں تک رسوم رواج ادا کیے جارہے ہوتے ہیں اور خیرات ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جب بھی کوئی انسان مرتا ہے چاہے وہ بچہ ہو یا بوڑھا اس کی موت پر تقریباً ایک ہی طرح سے رسم ورواج نبھائے جاتے ہیں البتہ بڑوں کے جنازے پہ لوگوں کی شرکت زیادہ ہوتی ہے۔ جب کسی انسان کی روح پرواز کرتی ہے تو اس کے گھر والوں میں پہلے بحث شروع ہوجاتی ہے کہ جنازہ کب اور کہاں ہوگا عموماً اس کے ورثا بیٹے، بھائی یا بڑے بزرگ ہی فیصلہ کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ گاؤں سے ہجرت کرکے آئے ہیں اس لیے پہلی تجویز جنازہ گاؤں لے کر جانے کی ہوتی ہے۔غریب یا کرایہ پر رہنے والے لوگ اپنے گاؤں میں گھر باراور برادری چھوڑ کے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔شہر میں نہ تو ان کے پاس جنازے کو رکھنے کی جگہ ہوتی ہے، نہ ہی مہمانوں کو بھگتانے کے لیے وسائل دستیاب ہوتے ہیں، اس لیے وہ اکثر جنازہ گاؤں لے جاتے ہیں۔ دس سال پہلے یہ بہت رواج تھا۔ اب تو زیادہ تر جنازے کو انھی گلی محلوں میں کسی کھلے میدان، کسی کے خالی پلاٹ، صحن یا چھت پر رکھ لیا جاتا ہے اور مہمانوں کو بٹھانے کے لیے کسی اور کی بیٹھک کھلوائی جاتی ہے جس میں کم از کم دو، تین دن تک دعاؤں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جیسے ہی جنازے کی جگہ کا تعین ہو جائے تو

وقت مقرر کیا جاتا ہے جس میں فیملی سے مشورہ کیا جاتا ہے اور موسم کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ گرمیوں میں جنازے کو زیادہ دیر تک نہیں رکھا جاتا کیونکہ اس کے لیے بہت سی برف، پنکھے یا روم کولر کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ جنازہ تو خراب ہوتا ہی ہے، گھر والے بھی بیمار ہوجاتے ہیں۔عموماً تنگ اور چھوٹے گھروں میں موسم گرما میں فوتگی پہ بہت مسئلے ہوتے ہیں۔موسم سرما میں اکثر جنازے کو اگلے دن دفن کیا جاتا ہے اور رشتہ دار، قریبی عزیز کسی دوسرے شہر ملک سے آنے والے کے لیے رات بھر بھی جنازہ رکھ لیا جاتا ہے۔سردی سے مردہ اکڑ نہ جائے۔اس لیے زیادہ تر مردے پہ گرم کمبل، رضائی، لحاف ڈالا جاتا ہے۔

مساجد میں چاروں طرف اعلانات کروائے جاتے ہیں جس میں مرنے والے کا تمام حسب نصب فلاں فلاں کا بھائی، بیٹا، داماد یا باپ مر گیا ہے اور اس کہ جنازے کا اور مقررہ وقت اور جنازہ گاہ کا اعلان کیا جاتا ہے اور لوگوں کو اس میں شامل ہو کر ثواب دارین حاصل کرنے تلقین کی جاتی ہے۔عموماً غیر معروف یا نئے لوگ جن کے مقامی لوگوں سے تعلقات نہیں ہوتے، وہاں چند لوگ ہی اعلان سن کے جنازہ پڑھنے آتے ہیں۔رسم یہ ہے کہ آپ کے عزیز کے جنازے میں وہی آئے گا جس کے عزیز کے جنازے میں کبھی آپ گئے ہوں گے یا کوئی دوستی کا تعلق ہو، رشتہ دار بھی اس موقع پر عموماً بدلہ لیتے ہیں۔

عموماً بڑی عمر کی خواتین تو اپنے اپنے برقعے اور چادریں لے کر تیار بیٹھی ہوتی ہیں کوئی جاننے والا ہو یا نہ ہو جیسے ہی اعلان سنتی ہیں ثواب کے لیے مرنے والے کے گھر پہنچ جاتی ہیں۔چاہیے وہ بچہ ہو یا بڑا عورت ہو یا مرد وہ جنازے والے گھر میں اس کے گھر والوں کو گلے لگا کے روتی ہیں اور اپنے مرے ہوئے عزیزوں کے نام لے لے کر روتی ہیں۔ عموماً جنازے والے گھر میں دو دفعہ عورتیں جاتی ہیں ایک دفعہ فوراً اعلان سن کے اور ایک دفعہ جنازہ اٹھانے سے قبل۔ جس میت والے گھر جتنی عورتیں زیادہ ہوں اتنی اس کی

مشہوری یا نیک نامی ہوتی ہے البتہ مرنے والے کی نماز جنازہ میں جتنے زیادہ لوگ شریک ہوں اس سے اس کی سماجی یا معاشی حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔لوگوں کے آنے سے قبل پڑوسی یا محلے دار فوری طور پر جنازے کو پہلا غسل دے دیتے ہیں۔ عورتوں کو عورتیں، مردوں کو مرد، چھوٹے بچوں کے جنازے کو ہمیشہ عورتیں ہی غسل دیتی ہیں۔اگر بڑے بچے کا جنازہ ہو تو پھر مرد غسل دیتے ہیں۔جس کے لیے ایک صابن، روئی اور عموماً کچی جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اگر موجود نہ ہو تو پکی جگہ بھی نہلا دیتے ہیں۔

پہلی دفعہ چھوٹا غسل وضو کی طرح دیتے ہیں اور اس کے کپڑے تبدیل کر دیتے ہیں جبکہ جنازہ اٹھنے سے تھوڑی دیر پہلے اسے دوبارہ بڑا اور تفصیلی غسل کسی ماہر بندے سے دلوایا جاتا ہے جسے کافور لگانے، کفن پہنانے کے ساتھ ساتھ جنازے کو پاک کرنے لیے غسل کی سنتیں اور فرائض کا علم رکھتا ہو۔کفن زیادہ تر آج کل تیار ہی مل جاتے ہیں لیکن انھیں زیادہ تر مرنے والے کے سائز کے مطابق ہی انتظام کیا جاتا ہے۔تیار کفن کی تھوڑی بہت فٹنگ گھر میں خواتین یا درزی بھی کر لیتے ہیں۔ آج سے دس پندرہ سال قبل بہت سے لوگوں کا کفن سعودی عرب سے آنے والے عزیز و اقارب نے آب زم زم میں بھگو کے قبل از وقت ہی لا کے صندوقوں میں رکھا ہوتا تھا جو اس وقت بہت رواج تھا۔ آج کل صرف آب زم زم کو مردہ نہلانے کے بعد مردے اور کفن پر چھڑک کر ہی ثواب حاصل کر لیا جاتا ہے۔

جس چارپائی پہ جنازہ رکھا جاتا ہے اس کے اردگرد قریبی عزیز و اقارب خواتین، بہن، بیٹی، بیوی، ماں، بھابی بیٹھی ہوتی ہیں اور جس کو جتنا دکھ ہوا اتنا ہی روتی ہیں۔ جنازہ مرد کا ہو یا عورت کا بچے کا رونے دھونے کا فرض صرف گھر کے اندر خواتین کے ذمے ہی ہوتا ہے۔مرد صرف باہر بیٹھ کے افسوس یا دعا اور انتظامات کرتے ہیں۔

جو بھی خواتین آتی ہیں یا کوئی قریبی رشتہ دار جنازے کا منہ دیکھنے کے بعد گلے لگ کے روتی ہیں اور دلاسہ دیتی ہیں۔ ایسے موقع پر اپنے پرائے کا پتا چل جاتا ہے جو گلے لگ کر نہ روئے اسے دکھ نہیں ہوا ہوتا۔

مردے کے لواحقین کو ہوش نہیں ہوتا۔ عموماً کوئی پڑوسی، پڑوسن یا قریبی عزیز چاہے گھر کے اندر کا ہو یا باہر کا جس کا حوصلہ اور جیب اجازت دے یا لین دین کیا ہوا ہوتا ہے وہ اس دن کے کھانے کا، بیٹھنے کا، قبر کا سب انتظامات اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ کسی غریب کا جنازہ آج تک ان آبادیوں میں کفن یا قبر کے بغیر نہیں رہا۔ بلکہ بہت احترام کے ساتھ کسی کو پتا چلنے کے بغیر محلے والے عزیز رشتہ دار اگر گھر والوں کی حیثیت نہ ہو تو سارے انتظامات مل جل کے کر لیتے ہیں۔

قبرستان کا فیصلہ گھر والے ہی کرتے ہیں۔ یہ فرض گھر کے کسی فرد کو دیا جاتا ہے۔ جو قبرستان میں جگہ ڈھونڈنے جاتا ہے کیونکہ شہروں میں قبر کے لیے جگہ ڈھونڈنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ عموماً پہلے جہاں عزیز و اقارب دفن ہوتے ہیں اسی قبرستان میں دور یا قریب جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قبرستان کمیٹی سے باقاعدہ قبر کی پرچی حاصل کی جاتی ہے اور محلے دار عزیز جوان لڑکے دو، چار گھنٹے لگا کے خود ہی قبر کھودتے ہیں۔ اس میں بہت ثواب ملتا ہے۔ پھر جنازہ دفن کرنے کے لیے سارے مرد گھر کے اندر سے میت اٹھا کے پہلے کسی کھلی اور مخصوص جگہ پر نماز جنازہ کرتے ہیں۔ جو قریبی مسجد کا امام پڑھاتا ہے اور اسی موقع پر کوئی رشتہ دار اعلان کرتا ہے کہ اگر اس شخص نے کسی کے ساتھ لین دین کیا ہوا ہے اسے معاف کر دیں یا فلاں وارث سے رابطہ کریں۔ اکثر لوگ دل میں ہی معاف کر دیتے ہیں۔ کچھ سامنے آ کر بھی بولتے ہیں، بہت کم قرض خواہ مانگتے ہیں۔ جنازہ گاہ سے آگے آہستہ آہستہ لوگ جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ قبرستان تک آدھے اور قبر تک صرف

قریبی رشتہ دار ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ گلاب کا عرق اور کافور دفناتے ہوئے بھی ڈالا جاتا ہے۔ پھر اسے منوں مٹی کے حوالے کر کے گھر کا رُخ کیا جاتا ہے۔

مرد حضرات تو جنازے کے ساتھ قبرستان میں ہوتے ہیں جبکہ خواتین جو مہمان آئی ہوتی ہیں ان میں کھانے کی تقسیم شروع ہو جاتی ہے جبکہ مرد مہمان جنازے سے واپسی پر کھانا کھاتے ہیں۔ اکثر سب گھروں میں پہلے دن صرف چنے یا سبزی والے چاول ہی علاقوں میں دیے جاتے ہیں البتہ دوسرے دن مرغی والے چاول بن جاتے ہیں اور تیسرے دن رسم قل پر باقاعدہ دعوت دی جاتی ہے۔ سب لوگوں کو نماز جنازہ کے بعد قل کی دعا کا وقت بتا دیا جاتا ہے۔ عموماً صاحب حیثیت مرنے والے کے گھروں میں رسم قل پر کئی کئی دیگیں چاول، سالن، زردہ کے علاوہ فروٹ بھی کافی مقدار میں منگوایا جاتا ہے اور پہلے دن کے بعد ختم قرآن اور کھجور کی گٹھلیوں پہ آیت کریمہ اور قل کا ہزاروں لاکھوں کے حساب سے پڑھنا بہت ثواب کا عمل سمجھا جاتا ہے۔ مرنے والے کے گھر پہلے پہلے پھوڑی (گھاس پھوس کی چٹائی) اب پلاسٹک کی بنی ہوئی چٹائی بچھائی جاتی ہے یہاں پہلی جمعرات تک باقاعدگی سے سب آ کر دعا پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد جمعرات پر صرف وہ لوگ ہی آتے ہیں جن کو دعوت دی گئی ہوتی ہے اور ہر جمعرات کو اپنی حیثیت کے مطابق کھانے کا انتظام رشتہ دار یا گھر والے خود کرتے ہیں۔

اب ایک ماہ گزرنے کے بعد آخری جمعرات آ جاتی ہے اور ڈشیں بنتی ہیں جو عموماً چار سو سے پانچ سو لوگوں کی ہوتی ہیں۔ دور دور سے عزیزوں، رشتہ داروں کے نام لیے جاتے ہیں اور جتنی حیثیت ہوتی ہے اس کے مطابق پانچویں جمعرات جمعہ یا چھٹی والے دن رسم چہلم ادا کی جاتی ہے اور چار پانچ سو کی جگہ عموماً 100 سے 150 قریبی عزیز، رشتہ دار بلائے جاتے ہیں کیونکہ میت کے لیے یہ رسم خالصتاً فیملی والوں کی طرف سے کرنی ہوتی

ہے۔ عموماً قل تک کے اخراجات بھی گھر والے کرتے ہیں اور کفن دفن بھی جس وجہ سے چہلم کے لیے اکثر قرض لینے کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ موسم اچھا ہو تو اکثر لوگ چالیسویں سے قبل ہی حیثیت کے مطابق قبر پکی کروا دیتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ مال دار ہوتے ہیں وہ ماربل یا قیمتی سنگ سنگ مر سے قبر کی اونچائی اپنی مرضی کے مطابق بنا لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو صاحب حیثیت لوگوں نے قبرستان میں حویلیاں بھی بنالی جاتی ہیں۔ خاندان کے لیے مرنے والے کے اثاثہ جات کے وارث تو ہوتے ہی ہیں۔ گھر کی دیگر اشیاء میں پیسہ، بزنس وغیرہ کی ملکیت کا بھی باہمی مشورہ سے تعین کیا جاتا ہے۔ لیکن جس کا کوئی وارث نہیں ہوتا، اس کے پرانے کپڑے، جوتے اور دیگر قیمتی سامان کے لیے تقسیم کا عمل شروع کیا جاتا ہے۔ اس میں سے جو جتنا قریبی ہوتا ہے اس کا حصّہ اتنا ہی زیادہ رکھا جاتا ہے۔ مرنے کے تیسرے دن بھی دعا کر کے نذر نیاز کسی غریب یا محلے کی مسجد کے امام کو بھجوا دی جاتی ہیں اور چالیسویں کے موقع پر ایک نیا جوڑا بمعہ جوتے، رومال، دوپٹا، سرمہ، عطر، جائے نماز دعا میں رکھا جاتا ہے اور ایک بڑی مقدار میں فروٹ اور کھانے کی ٹرے بھر کے جس مولوی نے جنازہ پڑھایا ہوتا ہے یا چالیسویں کے ختم میں دعا کروائی ہوتی ہے۔ یہ سارا سامان اسے بھجوا دیا جاتا ہے۔ اس طرح چالیس دنوں میں چالیس یا پچاس سال گزارنے والے بندے کو ہمیشہ کے لیے بھلا دیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ پھر پہلی عید پر، شب برات اور برسی پر حیثیت کے مطابق ختم قرآن کر کے دعا کے بعد کھانا چار پانچ سال تک برسی پر ہوتا ہے اور پھر سب اسے رسم و رواج کی نذر کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جاتے ہیں۔

ٹونے ٹوٹکے سے علاج

ہمارے ہاں زیادہ تر لوگ بیماری کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس جا کر مناسب طریقے سے چیک اَپ کرانے کے بعد علاج معالجے سے گھبراتے ہیں اور بیماری کو دم درود یا کسی ٹونے ٹوٹکے سے ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے بعض اوقات تو فائدہ ہوجاتا ہے اور اکثر اوقات بیماری کے اور بھی بڑھنے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک پرانی سوچ ہے اس پر ہم پابندی تو عائد نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ کمر درد جسے چُک بولتے ہیں اس کے لیے کسی ایسے شخص سے لات مرواتے ہیں جو الٹا پیدا ہوا ہوتا ہے۔ بازو اور پاؤں کی موچ درد کے لیے کسی ایسی لڑکی سے کالا دھاگہ بندھواتے ہیں جس کی منگنی تو کافی عرصے سے ہوئی ہو مگر شادی نہ ہو رہی ہو۔

بچوں کے بہت رونے کی بیماری کو نظر لگنا کہتے ہیں۔ اس کے علاج کے لیے جس شخص پر شک ہو اس کے ناڑے سے دھاگہ لے کر، عورت ہو تو پراندے یا دوپٹے سے دھاگہ لے کر اس کو جلا کر دھواں دیتے ہیں ویسے بھی اس مرض کا علاج چینی پھٹکڑی یا گول موٹی لال مرچوں کے ثابت پانچ، سات دانے لے کر جس بچے کو نظر لگی ہوتی ہے اس کے سر پر سے گھما کے چولہے پر جلا دیے جاتے ہیں جس کی بو نہ آئے تو کہتے ہیں اس بچے کو نظر لگی ہوتی تھی اور اس عمل سے اتر جاتی ہے۔

پیٹ کی ہر بیماری کے لیے فوری طور پر اجوائن کو پانی کے ساتھ کھلا دیا جاتا ہے۔ نومولود بچے کو درد ہو تو اسے کوٹ کے یا دوپٹے میں چبا کے اس کا پانی (منہ سے نکال کر) بچے کے منہ میں نچوڑ دیا جاتا ہے اور اجوائن کو توے پر بھون کر اس میں چینی ڈال کے پیس کر

بھی بچے کو دی جاتی ہے تو درد کا علاج ہو جاتا ہے۔

عام طور ہر بیماری کا علاج تیل کے ٹوٹکے سے بھی کیا جاتا ہے۔ چاہے مساج کریں، تیل میں پیاز، لہسن، گندم وغیرہ ڈال کے اسے گرم کر کے پھر بچے کی ناف میں اور کان میں ڈالتے ہیں۔ سونف اور اجوائن کو پانی میں اُبال کر اس کے علاوہ سبز چائے، پودینہ اور موٹی الائچی وغیرہ کا قہوہ بھی مختلف بیماریوں میں دیا جاتا ہے۔ ہلدی بھی بہت سی بیماریوں میں ٹونے اور علاج کے طور پر کچی پکی، کبھی دودھ میں ڈال کے کبھی توے پہ تیل میں براؤن کر کے زخم کے مرہم میں باہر کی چوٹ کے لیے اندر کے درد کے لیے دودھ میں ڈال دی جاتی ہے۔ ہلدی کو کچا یا پکا کر دونوں طرح سے علاج کیا جاتا ہے۔ انڈا بھی ہر بیماری کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ نمونیہ ہو یا کھانسی نزلہ زکام اور کمر درد کے علاج کے لیے مختلف طریقے سے کچا یا پکا استعمال کیا جاتا ہے۔ بلڈ پریشر کے لیے لہسن کو کچا نہار منہ کھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لسی کا روزانہ استعمال بھی اس مرض کے لیے کیا جاتا ہے۔ کالے یرقان میں لسی میں حلوہ کدو کا اچار ڈال کے کھلایا جاتا ہے جس سے LFT اور ESR کم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بے شمار جڑی بوٹیوں سے علاج کیا جاتا ہے، پیٹ خراب ہو تو فوراً دہی یا دودھ میں اسبغول کا چھلکا ڈال کے کھلا دیتے ہیں جسے آج کل ڈاکٹر بھی روزانہ معدہ کے مریض کو استعمال کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کٹے ہوئے زخم پر کپڑا جلا کر رکھ دیتے ہیں جس سے خون آنا بند ہو جاتا ہے۔ رات کے اندھے پن کے لیے سات گھروں سے روٹی مانگ کے کھلا دیتے ہیں، بکرے کی تلی کا خون نکال کے اس کے چند قطرے آنکھوں میں ڈال دیتے ہیں اور تلی کو کھانے سے بھی اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ کالے تل کھلا کے بھی رات کا اندھا پن دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

معدے کے مریض کو بھی مختلف مشورہ دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آگ

کے جلے ہوئے کے لیے بھی طرح طرح کے علاج کیے جاتے ہیں۔مثلاً اگر کسی کا ہاتھ جل جائے تو ہم لوگ نیل جو کپڑے کو سفید کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہ لگا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ٹوتھ پیسٹ بھی گھر میں موجود ہو تو یہ لگا دیتے ہیں۔اولے بارش کے دنوں میں بوتل میں اکٹھے کر کے رکھ لیے جاتے ہیں جو پانی کی شکل میں پڑے رہتے ہیں۔ اگر جلے ہوئے جسم پر یہ پانی لگایا جائے تو اس سے بھی جلد آرام کی توقع کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار ٹونے ٹوٹکے ہیں جو مختلف بیماریوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہمارے کھیل

کھیل صحت منداقوام کی نشانی ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں باقی شعبۂ زندگی کی طرح اس میں بھی تفریق ہے۔ باقاعدہ آبادیوں کے لیے گراؤنڈ،کلب وغیرہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کھیل کے لیے کوئی باقاعدہ میدان یا کھلی جگہ نہیں ہوتی، نہ ہی کھیل کا کوئی باقاعدہ سامان یا مناسب مواقع بچوں کو فراہم ہوتے ہیں۔ ان آبادیوں میں نہ تو کوئی پبلک پارک اور نہ ہی کوئی جھولے وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ عام طور پر درختوں کے ساتھ رسی باندھ کر جھولا بنایا جاتا ہے جسے پینگ کہتے ہیں۔ اُسی پہ بچے جھولا جھول کر اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ وہ بھی اُن گھروں میں جن میں جگہ زیادہ ہو یا صحن میں کوئی درخت وغیرہ ہو۔ عام طور پر بچوں کو جن سکولوں میں پڑھنے کا موقع ملتا ہے اس میں بھی باقاعدہ سے جھولوں کا انتظام نہیں ہوتا چاہے وہ پرائیویٹ یا گورنمنٹ سکول ہوں۔ پہلی دفعہ بچے جب سکولوں کی طرف سے پکنک پہ جاتے ہیں تو کسی دوسرے شہر کی سیر گاہ میں انھیں پہنچ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کھیل کود کے لیے اس طرح کے جھولے بھی ہوتے ہیں، ورنہ عام طور ان آبادیوں کے بچے اپنے بچپن میں انہی تنگ و تاریک گلیوں میں چھوٹے موٹے کھیل جن کی ہمارا ماحول اور معاشی حالات اجازت دیں، وہ کھیل کر بڑے ہوتے ہیں۔

لڑکے اپنے بچپن میں زیادہ تر کینچے (بنٹے) کھیلتے ہیں جو 10 روپے میں 100 مل جاتے ہیں۔ یہ کھیل کسی بھی کچی زمین میں گڑھا کھود کر کھیلا جاتا ہے اور ایک کینچے سے دوسرے کینچے کو نشانہ لگایا جاتا ہے۔ ایک بڑا بنٹا جیسے اینٹی (کیچا) کہتے ہیں اس سے چھوٹے بہت سارے کینچوں کو نشانہ لگایا جاتا ہے۔ جتنے اس میں سے گڑھے میں گر جاتے ہیں وہ

نشانہ لگانے والا بچہ جیت لیتا ہے۔ اگر کسی بچے کا نشانہ درست لگتا ہے تو دوبارہ نشانہ لگاتا ہے۔ اگر نشانہ خطا ہو جائے تو دوسرا کھلاڑی نشانہ لگاتا ہے۔ اس کھیل میں جیت اسی کی ہوتی ہے جو زیادہ بنٹے جیت لے۔ اس میں ایک طریقہ کار جفت اور طاق میں بھی طے کر لیا جاتا ہے۔ اگر طاق کا ہندسہ طے ہو تو گڑھے میں طاق بنٹے گرانے کا نشانہ لیا جاتا ہے اور اگر جفت طے ہو جائے تو اس کے مطابق بنٹے گرانے ہوتے ہیں۔ اس میں جیت جفت یا طاق کے حساب سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک طریقہ اور بھی ہے۔ دائرے میں دس، دس بنٹے لگا دیتے ہیں اور بچے اردگرد بیٹھ کے اپنی اپنی باری پر نشانہ لگاتے ہیں اور جو جتنا اچھا نشانہ لگا سکتا ہے، وہ اتنے ہی بنٹے جیت لیتا ہے۔ اس سارے کھیل میں بچے گنتی، جفت، طاق اور جمع تفریق وغیرہ سیکھ لیتے ہیں۔ بے شک انھیں سکول پڑھنے کے مواقع میسر نہ آئے ہوں۔ لڑکے اور بھی کھیل کھیلتے ہیں جس میں گلی ڈنڈا بہت اچھا کھیل ہے۔ اس میں لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو تراش خراش کر کے گلی بنائی جاتی ہے اور اسی طرح ایک لمبی سی لکڑی کا ڈنڈا بنا کے اس سے گلی کو مارا جاتا ہے۔ پھر گلی کو اس ڈنڈے پہ اچھالا جاتا ہے اور گنتی گنی جاتی ہے۔ جتنی بار اس ڈنڈے پر اُچھل کے بار بار گلی گرتی ہے اس سے نمبر شمار کرتے رہتے ہیں جب تک وہ ڈنڈے سے گر نہ اسے مارتے رہتے ہیں اور دونوں کھلاڑی اپنی اپنی باری میں گنتی گنتے ہیں جس نے زیادہ بار گلی ڈنڈے پر اچھال لی وہ جیت جاتا ہے۔

لڑکیاں عموماً رسی ٹاپ کھیلتی ہیں۔ دو لڑکیاں رسی کو گھماتی ہیں اور ایک کو اس پر کودنا ہوتا ہے۔ پاؤں کے نیچے سے بار بار رسی کو گزارا جاتا ہے۔ رسی پاؤں سے ٹکرائے بغیر مسلسل اچھلنا ہوتا ہے۔ رسی جیسے ہی پاؤں سے ٹکراتی ہے تو کھلاڑی آؤٹ ہو جاتی ہے۔ یہ کھیل کھلاڑی اکیلے بھی اپنے ہاتھوں میں رسی لے کر کھیل سکتی ہے۔ اسی طرح لڑکیاں

زیادہ تر چینجو کا کھیل کھیلتی ہیں جس میں چھوٹی سی جگہ کچی ہو یا پکی زمین پہ چار خانوں والے ڈبے بنا کے کھیلتی ہیں۔ اس کھیل میں لائن کے اوپر پاؤں رکھے بغیر خانہ کو کراس کرتی ہیں۔ مٹی کے چھوٹے سے ٹکڑے یا جوتوں والی پالش کی خالی ڈبیا میں مٹی بھر کے اُسے خانے میں پھینک کر پاؤں سے ٹھوکر مار مار کے خانوں کو باری باری کراس کرنا ہوتا ہے۔ پالش کی ڈبی کو ترتیب وار خانے میں اور پھر ترتیب الٹا کر کے ایک ٹانگ پہ کھڑے ہو کر خانے پھلانگتی ہیں۔ یہ کھیل چکور خانوں کی جگہ چھ گول خانوں کو آپس میں جوڑ کر بھی کھیلا جاتا ہے۔ جو گھڑوں کی طرح ہوتے ہیں اسے گھڑا چینجو کھیل بولتے ہیں۔

اس کے علاوہ اکثر کھیل لڑکے اور لڑکیاں مل کر بھی کھیلتے ہیں جس میں ملی جلی گھر اندر کھیلی جانے والی کھیلیں ہوتی ہیں۔ اکثر بارش کے موسم میں گھر کے اندر بستروں میں بہن بھائی کزن دوست اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مختلف تعداد میں پھیلا کے کھیلتے ہیں۔ اس گیم کو شروع کرنے سے پہلے چار، پانچ کھلاڑی اپنے اپنے نام رکھتے ہیں جیسے یسُو، پنجُو، ہار، کبوتر، ڈولی۔ یہ نام انگلیوں پہ گنے جاتے ہیں اور آخری انگلی پر جس کا نام آئے وہ بندہ جیتا ہے اور اسی وقت گیم سے نکل جاتا ہے۔ پھر کھیلتے کھیلتے پانچ، چھ کھلاڑیوں میں جو آخری بچ جاتا ہے وہ ہارنے والا ہوتا ہے، اسے ہاتھ جوڑ کے سب سے باری باری مار کھانا پڑتی ہے۔ پھر اسے اپنے بچاؤ کا موقع دیا جاتا ہے جو مارنے والوں کو چکما دے کر بچ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اسی طرح انگلیاں پھیلا کے ایک اور ان ڈور گیم کھیلی جاتی ہے جس میں یہ نظم پڑھی جاتی ہے:

”اکڑ بکڑ پھمبے پو
اَسی نوّے پورے سو
سو سے نکلا تیتر موٹا

چل مداری پیسہ کھوٹا
پیسے پچھے جج کھلوتی
جج نے پوچھیا کیہڑا راہ
پیر محمد وڈا بادشاہ''

جس پر بادشاہ آ جائے وہ جیت جاتا ہےاور یہ زیادہ بچے کھیل سکتے ہیں جس جس پہ بادشاہ آتا جاتا ہے وہ جیتا جاتا ہے۔آخری والا ہار جاتا ہے۔وہ نوکر بن جاتا ہےاور پھر اسے بھی ہاتھ جوڑ کے جیتنے والوں سے مار کھانا ہوتی ہے۔سزا دینے والے بادشاہ کی مرضی ہےاسے معاف بھی کرسکتا ہے۔پھر نئے سرے سے کھیل شروع کیا جاتا ہے۔

ایک اور کھیل بھی لڑکے اور لڑکیاں مل کے کھیلتے ہیں۔سب دائرے میں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک کھلاڑی کھڑے ہو کر کہتا ہے۔بول میری مچھلی کتنا پانی۔پہلے اپنے ٹخنوں پہ ہاتھ رکھ کے پوچھتا ہے اتنا پانی۔سب کہتے ہیں نہیں پھر گھٹنوں پر پھر رانوں پہ پھر پیٹ پہ آخر میں کندھوں اور جب گردن پہ ہاتھ رکھ کے پوچھا جاتا ہے اتنا پانی تو دونوں گروپس والے اسے اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتے ہیں جو اسے اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اس گروپ میں جا کر بیٹھ جاتا ہےاور آخر میں جس گروپ میں زیادہ بچے اکٹھے ہو جائیں وہ گروپ جیت جاتا ہے۔

ایک اور اسی طرح کا کھیل جو مل جل کے کھیلا جاتا ہے۔وہ بہت سے بچے سرکل میں چور سپاہی بن جاتے ہیں۔ایک بچہ سرکل میں چور ہوتا ہے۔باقی سب بچے سپاہی بن جاتے ہیں۔ہاتھوں کی زنجیر بنا کے اسے اندر بند کر لیتے ہیں۔ پھر وہ اپنے ہاتھ کا ہتھوڑا بنا کے باری باری زنجیر کے مختلف حصوں پہ رکھ کے پوچھتا ہے:

یہ تالا توڑوں گا؟

سب بچے جواب دیتے ہیں سپاہی کو بلائیں گے اور کھلاڑی ہاتھوں کی زنجیر کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں تا کہ وہ نہ توڑ سکے۔ وہ دو، تین جگہ رکھ کے ان کو چکما دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اچانک جب بچوں کا دھیان جس تالے سے ہٹ جاتا ہے وہ اسی جگہ کو کھول کے بھاگ نکلتا ہے۔ عموماً چور سب میں سے تیز بھاگنے والے بچے کو بنایا جاتا ہے اور پھر جو سب سے پہلے اسے پکڑ لے، وہ جیت جاتا ہے۔

دو بچیاں مل کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پاؤں جوڑ کر گول گول گھومتی ہیں جسے ککلی ڈالنا کہتے ہیں۔ اس دوران وہ یہ نظم پڑھتی ہیں:

تتلی ہوں میں تتلی ہوں
پھولوں سے میں نکلی ہوں
ٹھنڈا پانی پیتی ہوں
اوپر پنکھا چلتا ہے
نیچے منا سُوتا ہے
منے کی مّاں موٹی
کھاتی تھی ڈبل روٹی
ڈبل روٹی گئی بھُس
منے کی مّاں گئی رُس
منے کے ابو آئیں گے
لال کھلونا لائیں گے
مُنے کو کھیلائیں گے
منے کی مّاں کو منائیں گے

جتنی دیر تک یہ نظم پوری نہ ہو ان بچیوں کو گول گول چکر لگانے ہوتے ہیں جو بچی چکرا کے گر جائے یا ہاتھ چھوڑ ا لے وہ ہار جاتی ہے۔

زیادہ تر بچیاں گڑیاں پٹولے اور گڈی گڈے کی شادی بھی کھیلتی ہیں جس میں کپڑے سے گڑیا اور گڈا بناتی ہیں جس میں لمبے بالوں والی گڑیا ہوتی ہے اور چھوٹے بالوں والا یا گنجا گڈا ہوتا ہے، جو عموماً موٹا ہوتا ہے جس میں زیادہ کپڑے یا روئی بھر کے بنایا جاتا ہے۔ پھر کانے سے ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو بنایا ہوتا ہے اور با قاعدہ ان کے کپڑے، گھر برتن اور دیگر سامان بنا کے مٹھائی یا جوتوں کے خالی ڈبے میں ان کے الگ کمرے بنائے جاتے ہیں۔ پھر جس کی گڑیا ہو اُس کے گھر گڈے والے رشتہ لے کر جاتے ہیں اور اس کی شادی میں با قاعدہ بہت سی بچیوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اپنی اپنی چھتوں پہ شادی کی ساری رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ باقی بچیاں بھی اپنی اپنی گڑیا کو اچھے اچھے کپڑے بنا کے زیور گہنے پہناتی ہیں۔ لال رنگ کے دھاگے سے گڑیا کے ہونٹ اور کالے دھاگے سے خوبصورت آنکھیں بنا کے شادی میں شرکت کرواتی ہیں۔ اس موقع پہ جو گڑیا سب سے اچھی لگتی ہے، دوسری لڑکی اپنے گڈے کے لیے رشتہ مانگ سکتی ہے اور گڈی والی بچی کو اپنی گڑیا بمع سامان گڈے والی دوسری بچی کو دینی پڑتی ہے وہ روتے دھوتے دے دیتی ہے۔ اکثر اس موقع پر بچی کو اپنی گڑیا دینے کا دل نہ ہو تو وہ کوئی بہانہ کر کے رشتہ توڑ دیتی ہے مگر یہ صرف ناسمجھ اور چھوٹی بچی کرتی ہے۔ بڑی بچیاں سوچ سمجھ کے یہ کھیل کھیلتی ہیں اور بہت کم بچیاں اپنے گڈے بناتی ہیں۔ چار، پانچ گڑیا کے ساتھ صرف ایک گڈا ہوتا ہے۔ بچیوں کو بچپن سے ہی شادی کے لیے تیار کرنے کے لیے یہ کھیل کھلایا جاتا ہے بلکہ زیادہ تر بچیوں کو گڑیا ماں یا بڑی بہن خود بنا کے دیتی ہے اور اسے کھیل بھی سمجھاتی ہے۔

لڑکے ذرا بڑے ہو جائیں تو وہ گلی محلوں سے چھتوں پہ چڑھ کر دو قسم کے کھیل کھیلتے

ہیں۔ان میں سے ایک پتنگ اڑانے کا اور دوسرے کبوتر اڑانے کا۔ان دونوں کھیلوں میں پیسے رکھنے والے لڑکے شامل ہوتے ہیں اور عموماً ماں باپ بڑے کبوتر نہیں رکھنے دیتے مگر یہ سوچ کے کہ وہ کسی اور غلط صحبت میں نہ پڑ جائیں۔گھر میں نظروں کے سامنے رہنے کے لیے انھیں اس کی اجازت دے دی جاتی ہے۔اس کے لیے گھر کی سب سے اونچی چھت پر لوہے اور جالی کا پنجرا بنا کے اس میں کبوتر رکھے جاتے ہیں۔اکثر اوقات کبوتر ویسے ہی شوق سے پالے جاتے ہیں۔نر اور مادہ اس کے جوڑے بنا کر لکڑی کے بنے ہوئے فروٹ کے خالی کریٹ یا مٹی سے بنائے گئے خانوں میں انھیں اکٹھے چھوڑا جاتا ہے۔پھر نر اور مادہ جو انڈے دیتی ہیں ان کو الگ الگ خانوں میں مادہ کبوتروں کے نیچے رکھا جاتا ہے۔جو مقررہ ایام میں جب وہ بچے نکال لیتی ہے پھر سے اسے جوڑے بنا کے الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ ہر مادہ بچے نہیں نکال سکتی۔اس کے لیے بڑی اور بوڑھی مادہ سے خدمات لی جاتی ہیں اور دوسری جوان مادوں کے انڈے بھی اس کے نیچے رکھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس شوق کے علاوہ کبوتر بازی یعنی انھیں اڑنے کا کھیل باقاعدہ شرطیں جن میں نقد رقم یا انعامات وغیرہ طے کر کے کھیلتے ہیں۔اڑنے والے کبوتر نر اور مادہ الگ نسل کے ہوتے ہیں جو دبلے پتلے بڑے پروں والے ہوتے ہیں انھیں باقاعدہ دیسی گھی میں روٹی کی چوری بنا کے کھلائی جاتی ہے۔ پستہ بادام اور دوسری مخصوص خوراک کالے چنے گرم رکھنے کے لیے کھلائے جاتے ہیں پھر انھیں بار بار اڑا کے کھیل یا بازی کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور عموماً بہار کے موسم میں جب بہت گرمی نہ ہو تو یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔اس مقصد کے لیے تیسری منزل پہ پنجرے کے علاوہ دس،بیس فٹ اونچے بانس پہ ایک جنگلا کبوتروں کے لیے بنایا جاتا ہے جس پر کبوتروں کو اڑانے کے چھوڑا جاتا ہے اور جب وہ تھک کر اس جال پر بیٹھ جائیں تو پھر بانس سے انھیں چھیڑا جاتا ہے یا ایک اور نئے کبوتر کو نیچے سے اڑایا جاتا ہے تاکہ باقی کبوتر اس کبوتر

کے پیچھے پھر سے اُڑ نا شروع کر دیں۔ اس کھیل میں محلے بھر کے کبوتر باز نشانی کے طور پر اپنے اپنے کبوتروں کے پاؤں میں مختلف رنگوں کے پلاسٹک چھلے ڈال دیتے ہیں تا کہ وہ اپنے کبوتروں کو آسانی سے پہچان سکیں۔ اس کے علاوہ پروں کے نیچے اسی رنگ کی نشانی بھی بعض اوقات لگا دی جاتی ہے۔ جس کھلاڑی کے کبوتر شام یا رات تک اپنے جنگلے میں واپس نہ آئیں اور زیادہ دیر تک اڑتے رہیں وہ کھلاڑی جیت جاتا ہے۔ پھر نہ صرف اسے انعام دیا جاتا ہے اس کی دوسرے کھلاڑی دعوت بھی کرتے ہیں جس میں اکثر بازار سے تیار کھانا مرغی وغیرہ چلتا ہے اسی طرح کبوتروں کی بھی اچھی خوراک سے ضیافت کی جاتی ہے۔ لیکن اچھے گھر کے لڑکوں کو ایسے کھیل نہیں کھیلنے دیتے اسے جوا بھی کہتے ہیں۔

پتنگ بازی بھی بہت اچھا کھیل ہے۔ ہمارے ہاں بچے اپنے بچپن میں دو روپے کی پتنگ پانچ یا دس روپے کی ڈور (دھاگہ) لے کر اسے گولا بنا لیتے ہیں اور پتنگ میں دھاگے سے کنی باندھ کے اڑاتے ہیں۔ ایسا ہر بچہ فوری طور پر نہیں کر سکتا مہینوں یا ہفتوں کی محنت کے بعد اسے پتنگ اڑانا آتی ہے پھر جو بچہ جتنی اونچی پتنگ چڑھا لے اتنا ہی ماہر سمجھا جاتا ہے اور سب بچے عموماً دھوپ اور بھوک کی پرواہ کیے بغیر گھنٹوں چھتوں پر پتنگ اڑاتے ہیں اور سب کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ پتنگ کو اڑانے کے ساتھ ساتھ پیچا بھی لگائیں۔ ہمارے ہاں یہ دونوں کھیل صرف لڑکوں کے لیے ہی مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ لڑکیاں تو اس وقت چھت پہ بھی نہیں جا سکتیں جب ان کے گھر کے لڑکے پتنگ اڑا رہے ہوتے ہیں۔ اب تو یہ بڑا تہوار بن گیا ہے۔ پورے ملک میں حکومت کی پابندی کے باوجود بسنت میلہ منایا جاتا ہے جو عموماً بہار کی آمد پر مارچ کے پہلے ہفتے میں منایا جاتا ہے جس میں سب سے زیادہ پتنگیں کاٹنے والا اچھا کھلاڑی سمجھا جاتا ہے اور دوسری چھتوں پہ بھی گروپس میں کھلاڑی موجود ہوتے ہیں اس میں عمر کی نہیں تجربے کی اہمیت ہوتی ہے۔ کوئی بچہ بھی بڑے کی پتنگ

کاٹ دیتا ہے۔آج کل اس کھیل میں بے ایمانی نے زیادہ جگہ لے لی ہے۔دھاگے یعنی ڈور پر مختلف کیمیکل جس میں سریش کے ساتھ شیشہ پیس کے چڑھا دیا جاتا ہےاور دوسرے کھلاڑی کے سادے دھاگے کو کاٹ کر شور مچایا جاتا ہے بو کاٹا۔اسی طرح دھاگے کی جگہ پلاسٹک کی باریک ڈور بھی استعمال کی جاتی ہےاور کھیل گرم رکھنے کے لیے کئی کئی پتنگیں اور ڈور کے گولے رکھے جاتے ہیں اور پورا پورا دن اور رات چھت پر ہی کھانا پینا گانا بجانا،سونا جاگنا لگا رہتا ہے۔اس موقع پر پورا محلّہ اس جشن یا کھیل میں شامل ہوتا ہے۔اچھے اچھے پکوان پکائے جاتے ہیں۔باداموں والا دودھ یا دودھ جلیبی اور بہت سے کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس کھیل میں گھر کے بڑے بوڑھے حادثات کے ڈر کی وجہ سے اپنے بچوں کو کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے کہ کہیں بچے چھت سے گر نہ جائیں یا کھیلتے وقت کیمیکل ڈور سے ان کا گلا یا ناک کان،زخمی نہ ہو جائیں اور دھوپ سے ان کی رنگت نہ جھلس جائے مگر کئی سالوں سے تیزی سے پتنگ بازی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔پتنگ بازی ایک قدیم کھیل ہےلیکن اگر کھیل سمجھ کر کھیلا جائےلیکن موجودہ دور میں کیمیکل ڈور کی وجہ سے بے گناہ لوگوں کی موت واقع ہوتی ہے۔اس لیےحکومت نے مجبوراًاس کھیل پر پابندی لگا دی ہے۔

اس کےعلاوہ اخروٹ کے ذریعےبھی کھیل کھیلا جاتا ہے جو زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا بنا کےاخروٹ ملا کر پھینکے جاتے ہیں جو اس گڑھے میں جائے یا جس کو بڑااخروٹ سےنشانہ بنایا جائے وہ جیتنے والے کا ہو جاتا ہے۔اس کے لیےسخت اخروٹ استعمال ہوتے ہیں۔

جب یہاں مکان کم اور کھیت اور زمین زیادہ تھی تو جوان لڑکےاورلڑکیاں چھپن چھوت کھیلتے تھےیعنی ایک لڑکے نے دوسروں کوتلاش کرنا ہوتا تھا۔یہ دوڑ دھوپ کا کھیل تھا۔

ہماری خوراک

فوڈ سٹریٹ کے مزے پیسوں والے اُٹھاتے ہیں یا کے ایف سی اور میکڈونلڈ کے برگر امیر زادے کھاتے ہیں۔ افطار بوفے، فرائی مچھلی غریبوں کے نصیب میں کم ہے۔ ہم بہت اچھی خوراک یا مرغ مسلم تو کھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے مگر ہم جو بھی کھانے پکاتے ہیں وہ بھوک کے وقت ہمیں بہت لذیز محسوس ہوتے ہیں۔ ہمارے غریب طبقے میں عام طور پر بہت کم ماہانہ تنخواہ یا روزانہ کی اُجرت پر کام کرنے والے لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہے، جو بمشکل روزانہ کی بنیاد پر اپنے خاندان کے لیے دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں۔ سبزی، دال یا اس میں استعمال ہونے والے مصالحہ جات اور گھی، تیل سب کے سب اتنے مہنگے ہیں کہ غریب آبادی میں مقیم لوگوں کے لیے اکٹھا خرید کر سٹاک کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اس لیے محلے میں موجود پرچون کی دوکان سے یا گلی میں آنے والے سبزی کے ٹھیلوں (ریڑھیوں) سے خریدا جاتا ہے۔ صبح صبح ناشتہ کے وقت پہلے پہل ہر محلے میں تندور نہ ہونے کی وجہ سے باہر سڑک پر موجود یا کسی بس اسٹاپ پر موجود تندور سے کوئی بندہ ایک دو روپے کا نان لے کر پھیری لگا کے گلی محلوں میں پچیس یا پچاس پیسے فی نان اپنا منافع رکھ کے گھروں کے دروازوں پر صدا لگا کے نان فروخت کرتا تھا اور اس طرح کے دو، چار ہی نان فروش پھیری لگاتے تھے۔ پھر ذرا جدید دور آیا تو محلے میں ایک دو تندور بھی بن گئے اور لوگ اس سے نان خریدنے لگے۔ اس پھیری والے نے نانوں کی جگہ حلوہ پوری اور چھولے فروخت کرنے شروع کر دیئے۔ اب وہ باقاعدہ یہ صدا لگاتا ہے کہ پانچ روپے کی پوری حلوہ چھولے مفت۔ اکثر بچے پلیٹ اٹھا کر کہتے ہیں چاچا کی وہ مفت والی حلوہ پوری

اور چھولے دے دیں۔ پوری کے پیسے بھی امی نہ دیتی اور الگ سے بچوں کو ڈانٹ بھی پڑتی لیکن آج وہ نان پانچ روپے اور پوڑی بارہ روپے کی ہوگئی ہے اور اب باقاعدہ دوکانوں پر یہ کاروبار ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ناشتے کے لیے محلے میں چھوٹی چھوٹی دوکانیں کھل گئیں اور انھوں نے شیشے کی الماری میں بند اور ڈبل روٹی کے ساتھ چھوٹی سی مکھن کی ٹکیاں بھی رکھ لیں۔ دس پندرہ سال قبل شیور انڈے یا شیور مرغی کا گوشت نہ تو ہماری خوراک کا حصّہ تھے بلکہ اس وقت کسی نے ایسی کوئی چیز دیکھی تک نہ تھی۔ صرف دیسی مرغیاں ہوا کرتی تھیں۔ دیسی مرغیوں کے انڈے ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ کھائے جاتے تھے۔ البتہ مرغی صرف اس وقت پکائی جاتی تھی جب کوئی مرغی بیمار ہوجاتی تو اس کو ذبح کرلیا جاتا یا کوئی مرغی انڈے دے دے کر بیمار پڑ جاتی اور اس کے تندرست ہونے کی اُمید باقی نہ رہتی تو تب اسے ذبح کیا جاتا، اس زمانے میں پھر بھی یہ صحت مند خوراک سمجھی جاتی تھی۔ ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے کے لیے بہت سے ریڑھی والے آج تک سبزیاں فروخت کرنے آتے ہیں۔ وہ منہ اندھیرے بڑی مارکیٹوں یا سبزی منڈی سے ہول سیل سبزیاں خرید کر لاتے ہیں اور جیسے ہی ان غریب آبادیوں میں پہنچتے ہیں تو سورج کی طرح ان کے ریٹ بھی اونچے ہو چکے ہوتے ہیں البتہ ان سبزی فروشوں کا ایک فائدہ ہوتا ہے کہ گھریلو خواتین جن کو بازار جانے کی اجازت نہیں ہوتی وہ ان سبزی فروشوں سے سبزی خرید لیتی ہیں اور اس طرح ان کے بازار جانے کا وقت بچ جاتا ہے اور انھیں دروازے کی دہلیز پہ ہی سبزی مل جاتی ہے۔ عام طور پر جس سبزی والے کے پاس صرف ایک ہی چیز رکھی ہوتی ہے، وہ اسے اچھے اور کم نرخوں فروخت کرتا ہے کیونکہ اسے شام کو ریڑھی خالی کرنا ہوتی ہے بے شک اسے منافع کم ہی ملے، اسے مجبوراً سارا مال ختم کرنا پڑتا ہے تاکہ اگلے دن تازہ سبزی فروخت کے لیے لا سکے۔ اس کے مقابلے میں جو

سبزی والا ایک ہی ریڑھی پر تھوڑی تھوڑی سبزی رکھ کر لاتا ہے جو اسے منڈی سے مہنگے داموں ملتی ہے اور اس نے بھی آگے ہمارے گلی محلوں میں مہنگے داموں فروخت کرنا ہوتی ہے اور اس وجہ سے اس کا سارا سودا ایک دن میں ختم نہیں ہوتا اور وہ اگلے دن پھر اسی باسی سبزی پر پانی چھڑک کر لے آتا ہے۔ سردیوں میں کئی کئی دن وہ بیچارہ یہی سبزی فروخت کرتا رہتا ہے جبکہ گرمیوں میں اس کی یہ باسی سبزی دو تین دن سے زیادہ نہیں چلتی ہے۔

سبزیوں میں کوئی ایسی سبزی نہیں ہے جسے ہم لوگ کھا یا پکا نہ سکیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے سبزیاں پکا کر کھاتا ہے۔ بے شک زمین کے اندر اُگنے والی ہوں یا زمین کے اوپر اُگنے والی سبزی ہو، بیج والی ہو یا چھلکے والی، پتوں والی ہو یا پتوں کے بغیر جو بھی ہو سب اپنے اپنے انداز سے کھائی اور پکائی جاتی ہیں۔

عام طور پر گوبھی آلو، مٹر، بھنڈی توری، کدو، پالک، شلجم، گاجر، سرسوں کا ساگ، شملہ مرچ، آلو کریلے، اروی، کچالو، سب سبزیاں الگ الگ اور کبھی کبھی گوشت میں ڈال کر مختلف ڈشیں بنائی جاتی ہیں۔ پیاز، لہسن، ٹماٹر اور ادرک تو سب کھانوں میں لازمی جزو کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ سبزیاں قیمہ میں بھی پکائی جاتی ہیں۔

گلی محلے سے اگر ریڑھی والے سے مناسب سبزی نہ مل سکے تو علاقے میں موجود دوکانوں سے بھی سبزی خریدی جاتی ہے مگر وہ ریڑھی والے کے مقابلے میں کافی مہنگی دیتے ہیں۔ کیونکہ دوکان والے نے اپنا خرچہ، منافع کے علاوہ دوکان کا کرایہ اور بجلی وغیرہ کے بلز بھی اسی آمدن میں سے پورے کرنا ہوتے ہیں۔ ہر سبزی کے ساتھ پیاز تھوڑا سا ٹماٹر، لہسن، تھوڑی سی مقدار میں ہری مرچ اور دھنیا تو چونگے کے طور پر لے کر گزارا کیا جاتا تھا لیکن اب خواب بن کر رہ گیا ہے۔

محلوں میں موجود پرچون کی دکانوں سے عموماً لوگ دالیں بہت معمولی مقدار میں

خریدتے ہیں۔ پاؤ، آدھا کلو یا اپنی فیملی کے حساب سے لے کر پکائی جاتی ہیں۔ لال لوبیا ہو یا سفید، کالے چنے ہوں یا سفید، دال چنا، دال مسور، دال ماش یا دال مونگ تمام دالیں ہم پکاتے کھاتے ہیں اور ان میں سے بعض ابال کر بعض بھون کر اور کوئی دھونی لگا کے بھجیا بنا کر تیار کی جاتی ہیں۔

اکثر گھروں میں دال مسور یا لال لوبیا، سفید چاولوں کے ساتھ ابال کر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ڈش کے ساتھ عام طور پر سلاد بہت پسند کیا جاتا ہے اور اگر پیاز ٹماٹر مہنگے ہوں اور سلاد کے طور پر استعمال کرنے میں مہنگے محسوس ہوں تو سلاد کی جگہ اچار استعمال کیا جاتا ہے جو اکثر و بیشتر گھروں میں ہی تیار کیا جاتا ہے۔ آج سے چند سال قبل بازار میں ہر دوکان سے پرچون کے حساب سے دس، بیس روپے میں تھوڑا بہت اچار مل جاتا تھا۔ اکثر لوگ کلو، دو کلو اکٹھا منگوا کے رکھ لیتے تھے۔

گھی بھی اکثر لوگ تھوڑا تھوڑا ایک وقت کے لیے منگواتے ہیں۔ البتہ نمک مرچ ہلدی کے لیے چھوٹی چھوٹی ڈبیاں ہر گھر میں الگ الگ رکھی ہوتی ہیں، جو ریڑھی پر مصالحے فروخت کرنے والے سے دس یا بیس روپے کی لے کر رکھی جاتی ہیں۔ کھانوں میں عام طور پر دہی بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ہماری آبادیوں میں اکثر اوقات کھلے دودھ سے مٹی کے بڑے بڑے گول تھالوں میں (جیسے کنڈے بھی ہیں) دہی خود بنایا جاتا ہے۔ رات بھر اسے جاگ لگا کے رکھ دیا جاتا ہے اور صبح سویرے دہی جم جاتا ہے۔ پھر شام کے استعمال کے لیے صبح کے وقت دودھ کو جاگ لگا دی جاتی ہے اور شام تک دہی تیار ہو جاتا ہے اور یہ دہی رات تک فروخت کیا جاتا ہے۔ ہر بندہ پاؤ سے لے کر کلو تک دہی کھانے کے لیے لے کر جاتا ہے جسے کھانے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ چینی، نمک، پودینے اور دھنیے کی چٹنی بنا کر اسے دہی میں ڈال کر چٹنی بھی بنائی جاتی ہے اور پیاز، ٹماٹر اور ہری مرچیں کاٹ کے دہی

میں ڈال کر دہی کا رائتہ بھی تیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر چٹنی تو گھر والے اپنے کھانے کے لیے بناتے رہتے ہیں مگر رائتہ زیادہ تر مہمانوں کی آمد کے وقت تیار کیا جاتا ہے جسے چاولوں وغیرہ کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور جب گھر میں کھانے کے لیے چاول (پلاؤ) بنایا جاتا ہے جس میں مٹر، چنے، دال یا گوشت کے علاوہ آلو بھی ڈالے جاتے ہیں۔ صرف چاولوں سے ہی ایک وقت گزارا کر لیا جاتا ہے اور اس دن سالن بنانے کا تردد نہیں کیا جاتا۔

ہمارے ہاں عموماً سالن کے ساتھ زیادہ تر روٹی کھائی جاتی ہے۔ اس لیے روٹی ہر فیملی میں اپنے اپنے طریقے سے بنائی جاتی ہے۔ پہلے پہل ہر گھر میں ایک عدد تندور بنایا جاتا تھا جس میں گھریلو خواتین اپنے ہاتھوں سے مختلف طریقوں سے روٹیاں لگاتی تھیں۔ کبھی آٹا خمیرہ کر کے خمیری روٹی بنائی جاتی تھی اور کبھی پتیری روٹی بنائی جاتی تھی، کبھی گندم کی میٹھی روٹی اور کوئی مکئی کی روٹی بنائی جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو باجرے کی بھی روٹی تندور پر بنائی جاتی تھی۔ اب ہر گلی محلے میں تندور کھلنے سے گھروں میں تندور بہت کم رہ گئے ہیں۔ اب چند خالص دیہاتی گھروں میں ہی تندور دیکھے جاتے ہیں۔ وہ بھی آج کل گھروں کے تنگ ہونے اور صحن پکے ہونے کی وجہ سے چھتوں پر شفٹ ہو گئے ہیں۔ پہلے ان تندوروں کے لیے گوبر کے اُپلے جو با آسانی دستیاب ہو جاتے تھے اور سستے بھی مل جاتے تھے وہ جلانے کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ اب زیادہ تر فروٹ کی خالی پیٹیوں یا پرانی لکڑیوں سے جلانے کے علاوہ گیس کے کمرشل تندور بھی بازار سے مل جاتے ہیں۔ ان کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے۔

عام طور پر ان آبادیوں میں رات کا کھانا پہلے پہل مغرب کی نماز کے بعد فوراً کھا لیا جاتا تھا۔ اب لوگوں نے اپنے لیے کھانے پکانے کے علاوہ اور بھی سرگرمیاں پال رکھی ہیں۔ اس لیے کھانے کا باقاعدہ سے کوئی مخصوص وقت نہیں رہا۔ بعض لوگ جلدی کھانا کھا

لیتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ رات کو دیر تک کام کرنے کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آج کل گیس کی لوڈ شیڈنگ کا ایک نیا مسئلہ شروع ہو گیا ہے جس نے لوگوں کی معمول کی زندگی کے علاوہ خصوصاً کھانوں کے اوقات بھی تبدیل کر دیے ہیں۔

گھروں کے علاوہ کئی آبادیوں میں کھانے کے چھوٹے موٹے سٹال اور ہوٹل بھی ہیں جو آبادیوں سے باہر مین شاہراؤں پر واقع ہوتے ہیں۔ ہوٹل والوں کے علاوہ، چھابے والا ہو یا ریڑھی والے سب سے کم پیسوں میں تیار چنے، حلیم، پائے، اوجھڑی، کباب اور پکوڑے تک فروخت کرتے ہیں اور وہ سستے داموں مل جاتے ہیں۔ اسی طرح سموسے، چنا چاٹ، دہی بھلے اور فروٹ چاٹ بھی گلی محلوں میں ٹھیلے والے دس، بیس روپے کی پلیٹ میں دے دیتے ہیں اور کئی چاٹ والے یہ کام گزشتہ پندرہ بیس سالوں سے کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اُبلے ہوئے کچالو، شکر قندی بھی لیموں نچوڑ کر اور مصالحے ڈال کر فروخت کی جاتی ہے۔

آج کل پھل تو بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں۔ پھل اتنے مہنگے ہیں کہ عام طور پر بیمار ہونے کے بعد ہی کھانے کو ملتے ہیں لیکن اگر پھل بیمار ہوں یعنی زخمی یا داغی تو وہ سستے داموں مل جاتے ہیں۔ بعض اوقات کچے پھل بھی فروخت کیے جاتے ہیں جو سستے داموں مل جاتے ہیں لیکن اگر زیادہ دیر تک رکھے جائیں تو وہ گل جاتے ہیں تو پھر ریڑھی والے ان کے ریٹ کم کر کے سیل لگا دیتے ہیں۔ انھیں غریب لوگ اپنی استطاعت کے مطابق خرید کر گھروں میں لے جاتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے ہاں لوگ نئے موسم کے پھل تو شاید بہت کم ہی خرید سکتے ہیں کیونکہ ان کے ریٹ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ عام آدمی انھیں نہیں خرید سکتا۔ اسی طرح بعض پھل دور دراز علاقوں سے منڈیوں میں لائے جاتے ہیں جو واقعی مہنگے ہوتے ہیں مثلاً انار، انگور، سٹرابیری، چیری، چیکو، پپیتا، انھیں صرف ہم اپنے بچوں کی

کتابوں میں دیکھ کرخوش ہوسکتے ہیں،انھیں خرید کر کھانا واقعی ہمارے بس سے باہر ہے۔

اسی طرح آج کل کسی بھی قسم کا گوشت موٹا یعنی گائے بھینس کا یا بکرے اور مرغی کا بہت زیادہ مہنگا ہو گیا ہے۔ چھوٹے گوشت کی صرف ایک آدھ دوکان ہی مارکیٹ میں ہوتی ہے۔ وہاں بھی صرف چندافراد ہی روزانہ گوشت خریدنے کے لیے آتے ہیں جبکہ غریب لوگ محض چھوٹے گوشت کی یخنی بنانے کے لیے پاؤ بھر گوشت ہی خرید پاتے ہیں، وہ بھی جب ڈاکٹر انھیں مہنگے وٹامن لکھ دیتا ہے تو پھر وہ ان کی جگہ پیسے بچانے کے لیے گوشت کو دوائیوں کی بجائے سستا نسخہ تصور کرتے ہیں اور گوشت کی یخنی بنا کے پینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تو انھیں بکرا عید پر جب قربانی ہوتی تو سال میں ایک دفعہ ہی جی بھر کے چھوٹا یا بڑا گوشت کھانے کو مل جاتا ہے۔ کیونکہ مہنگائی بڑھنے کے بعد بکروں کی قربانی میں کمی واقع ہوئی ہے تو اب ان کو چھوٹا گوشت سال بعد بھی نہیں ملتا۔ جیسا کہ شروع میں دیسی مرغی کے بیمار ہونے کا ذکر کیا گیا تو اب مرغی بیمار ہونے کا اب انتظار نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ اب پولٹری فارمنگ بہت زیادہ ہوگئی ہے اور لوگوں نے دیسی مرغی کی جگہ شیور مرغی استعمال کرنا شروع کر دی ہے جو پہلے تو دال اور سبزی کے مقابلے میں کم ریٹ پر مل جاتی تھی لیکن اب اس کے ریٹس بھی بہت زیادہ ہوگئے ہیں اور یہ غریب آدمی کی پہنچ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے غریب لوگ چھوٹے گوشت کی کمی مرغی سے ہی پوری کر لیتے تھے مگر اب یہ بھی ان کے بس سے باہر ہے۔ عام طور پر آج کل مچھلی پکا کر کھانے کو بہت پسند کیا جاتا ہے مگر ہمارے ہاں خواتین اس کو پکانے کے سلیقے سے ناواقف ہیں۔ چند ماہر گھروں کی خواتین جو دوسرے شہروں سے ہجرت کر کے آئی ہیں اور جنھیں ہم (اردو سپیکنگ) کہتے ہیں۔ یہ لوگ مچھلی اچھے طریقے سے پکاتے اور کھاتے ہیں۔ بڑے بازاروں میں فرائی مچھلی کھانے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ مرد حضرات تو جا کر دوستوں کے ہمراہ مچھلی کھانے کا شوق مہنگے داموں

بھی پورا کر لیتے ہیں مگر گھروں میں بچے مچھلی کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح شیور انڈے بھی ہر گلی محلے کی دوکان پر آ گئے ہیں جس کی وجہ سے گھروں میں مرغیاں پالنے کا رواج تو بالکل ختم ہو گیا ہے۔شیور انڈے بازار سے خرید کر استعمال کر لیے جاتے ہیں۔

دودھ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پہلے وافر مقدار میں بھینسیں ان آبادیوں میں ہوا کرتی تھیں مگر گزشتہ چار پانچ سال قبل ان علاقوں سے بھینسوں کے انخلا کے بعد اب دودھ دور دراز علاقوں سے گاڑیوں،موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں میں لوہے کے بڑے ڈبوں میں بھر کر لایا جاتا ہے جس کے خالص ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا۔دودھ میں پانی ہو یا نہ ہو پانی میں دودھ ملا کے فروخت ضرور کیا جاتا ہے۔کوئی بندہ گھر سے دس کلو دودھ بالٹی میں ڈال کے فروخت کرتا ہے تو جس گھر میں وہ دودھ دیتا ہے اسی مقدار میں اُس گھر سے پانی لے کر پینے کے بہانے سے دودھ میں شامل کرتا رہتا ہے۔آخر میں سارے گاہکوں کو دودھ دینے کے باوجود وہ اتنا ہی دودھ اپنے گھر واپس لے جاتا ہے۔

اب ڈبے کے دودھ کے استعمال کا رواج بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ دودھ ڈبوں میں کہاں ملتا ہے وہ تو شاید Tea Whitner یا کیمیکل ہی ہوتا ہے۔البتہ میڈیا خصوصاً ٹی وی پر اس کے بہت سے فوائد بتائے جاتے ہیں اور سب سے بڑا فائدہ اس دودھ کے استعمال کا بتایا جاتا ہے وہ یہ کہ کسی بھی ایمرجنسی میں آپ اس دودھ کو استعمال کر سکتے ہیں۔یہ دودھ کے ڈبے ایک پاؤ کی پیکنگ میں بھی دستیاب ہوتے ہیں جنھیں لوگ استعمال کرتے رہیں اور ساتھ ساتھ کہتے رہتے ہیں کہ چائے ویسے بھی کون سی صحت کے لیے مفید چیز ہے۔اس لیے اس دودھ کو چائے میں استعمال کرنا ویسے ہی نقصان دہ ہے۔یہ سب جاننے کے باوجود چائے تو ہماری خوراک میں کھانے سے زیادہ اہم جزو بن گئی ہے چاہے خلوص ہو یا نہ ہو،مہمانوں کو چائے

لازمی پلائی جاتی ہے۔ ناشتہ تو چائے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔صبح ہو، شام ہو یا رات کو بھی چائے پی جاتی ہے۔سبز قہوہ اب صرف ہاضمے کو درست کرنے کے لیے یا دوائی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔اکثر گھروں میں قہوہ بھی ناپید ہو گیا ہے۔

حصول تعلیم کے ذرائع

ماں کے پیٹ میں بچے کی پوری زندگی کی منصوبہ بندی امیر والدین کرتے ہیں۔ اس نے کہاں سے پلے گروپ میں تعلیم کرنی ہے۔ کس سکول اور کالج میں پڑھنا ہے۔ دنیا کی کس یونیورسٹی میں ڈگری لینی ہے۔

لیکن ہمارے ہاں عام طور پر تعلیم کے لیے ہمارے ہاں کوئی اعلیٰ نظام تعلیم یا ماڈل سرکاری سکولوں کا باقاعدہ نیٹ ورک موجود نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نہ ہی کوئی مربوط نصاب تعلیم ہے۔ خاص طور پر مضافات اور کچی آبادیوں میں تو حکومت کی طرف سے تعلیمی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کہیں دور دراز علاقوں میں بچوں کا ایک آدھ پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کئی کئی آبادیوں کے لیے قائم کیا جاتا ہے جس میں بچے ٹاٹ پر بیٹھ کر درختوں کے نیچے کھلے میدان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بچیوں کے سکولوں کی تعداد بھی نہ ہونے کی برابر ہے جس کی وجہ سے 60 سے 80 بچیوں کو ایک ہی کمرے میں تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔ سرکار کے پاس وسائل کی کمی کی وجہ سے فرنیچر اور کمرہ فراہم نہ ہونے کی وجہ دو سے تین بچیوں والے بنچ پر چھ چھ بچیوں کو اکٹھا بیٹھنا پڑتا ہے جس وجہ سے بچوں کے والدین کے علاوہ سیاسی وسماجی شخصیات سے چندہ کر کے فرنیچر خریدنے اور کمروں کا متبادل بندوبست کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اب تو ایک اور رواج بھی ہوگیا ہے کہ اگر اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کی ضرورت ہو اور حکومت کے پاس ان کی تنخواہوں کے لیے وسائل نہ ہوں تو بچوں سے سو، پچاس روپے ماہانہ چندہ اکٹھا کر کے contract پر اساتذہ رکھ لیے جاتے ہیں جو کئی کئی سال تک اسی بندوبست کے تحت بچوں

کو پڑھاتے رہتے ہیں۔اس بندوبست کے تحت نہ تو اساتذہ کا کوئی مستقبل ہوتا ہے اور نہ ان کی پڑھائی سے بچوں کا کوئی مستقبل نظر آتا ہے۔ہمارے پسماندہ معاشرے میں لڑکے لڑکیاں عام طور پر پرائمری کلاس تک ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پچاس فیصد بچے پرائمری سے ہی بھاگ جاتے ہیں۔ بہت کم بچے مڈل تک پہنچ سکتے ہیں اور اس سے بھی کم جو خوش قسمت ہوتے ہیں، وہ مڈل کے بعد میٹرک کر پاتے ہیں۔لڑکے تو گھومنے پھرنے، کھیل کود میں دلچسپی لینے کی وجہ سے آٹھویں جماعت یا بورڈ کا امتحان پاس کر لیتے ہیں، وہ بھی بیس بیس سال کی عمر میں کئی بار سپلی آنے کے بعد بہت کم نمبروں میں دسویں پاس کر پاتے ہیں۔ عام طور پر لڑکیاں تعلیم میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔مگر ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ آٹھویں تک جوان ہو چکی ہوتی ہیں اس لیے انھیں گھر سے باہر جانے کی اجازت بہت کم ملتی ہے جس سے انہیں پڑھنے کا وقت مل جاتا ہے اور وہ زیادہ تر آسانی کے ساتھ دسویں پاس کر لیتی ہیں۔

گورنمنٹ سکولوں کے علاوہ ہمارے ہاں جو پرائیویٹ نظام تعلیم رائج ہے وہ گلی محلوں کی حد تک بہت اعلیٰ نہیں ہے مگر لوگ عام طور پر گورنمنٹ سکولوں میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے اور سکول دور ہونے کی وجہ سے چھوٹے بچوں کو پرائمری تک پرائیویٹ سکولوں میں پڑھانے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان سکولوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ اکثر اوقات ان سکولز کے بورڈ پر اردو میں لکھا ہوتا ہے انگلش میڈیم اور انگلش میڈیم میں بھی نصاب آدھے سے زیادہ اردو میں ہی ہوتا ہے۔صرف انگریزی اور سائنس کی کتابیں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اس میں بھی وہ ہی A سے Apple اور C سے Cat اور D سے Dog پڑھایا جاتا ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں بچے شروع ہی سے کتے اور بلیوں سے کھیلتے ہیں جبکہ وہ زندگی میں کبھی بھی C سے CAR اور D سے ڈاکٹر نہیں بن سکتے اور نہ ہی

انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ ان گلی محلوں کے پرائیویٹ سکولوں کا تعلیم کے میدان میں ایک بہت اہم کردار ہے کیونکہ وہ ایک خاص سطح تک ملکی خواندگی میں حکومت کی مدد کر رہے ہیں۔ ان آبادیوں میں قائم کیے گئے سکولوں سے بچے پرائمری یا مڈل تو پاس کر لیتے ہیں اور اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں لیکن ان پرائیویٹ سکولوں کے مالکان حالات اچھے نہیں ہوتے۔ کسی بھی گلی محلے میں پرائیویٹ سکول چلانا کسی پرچون کی دوکان چلانے سے کم نہیں ہوتا، جہاں کبھی تیل ختم ہوتا ہے تو کبھی نمک اور سکول کے مالک کو پرنسپل سے لے کر چپڑاسی تک کا کردار خود ادا کرنا پڑتا ہے اور اکثر اوقات سکولوں میں کنٹین کے اندر ٹافیاں اور پاپڑ بھی فروخت کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ ان سکولوں میں منافع تو کبھی بھی بچوں کی ادا کردہ ماہانہ 100، 50 روپے ماہانہ فیس سے نہیں نکل سکتا بلکہ منافع بچوں کو کتابیں کاپیاں اور ربڑ پنسل بیچ کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

گلی محلوں کے ان سکولوں میں ایک چیز جو گورنمنٹ سکولوں سے الگ ہے، وہ ہے مخلوط نظام تعلیم۔ ان میں لڑکے اور لڑکیاں کم از کم پرائمری اور مڈل تک اکٹھے پڑھتے ہیں۔ بعض اوقات ذرا پوش علاقوں میں موجود سکولوں میں ہائی کلاسز یعنی دسویں تک بھی بچے اور بچیاں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جس سے تھوڑے بہت مسائل تو کہیں نہ کہیں آ ہی جاتے ہیں مگر بچیوں کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ وقت زیادہ ملنے سے اکثر بورڈ کی سطح کے امتحانات میں بھی جب پرائیویٹ سکولوں کا رزلٹ آتا ہے تو بچوں کے اچھے نمبرز آ جاتے ہیں کیونکہ سکولز زیادہ ہونے کی وجہ سے مقابلہ زیادہ ہوتا ہے جس وجہ سے معیار تعلیم بہتر ہو رہا ہے لیکن ان سکولز کو بہت سے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ ایک حکومت کی طرف سے کبھی بھی انھیں کسی معاملے میں تعاون حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ حکومت زیادہ پیسے کمانے کے لیے پرائیویٹ سکولوں کو بجلی، پانی، گیس سب کمرشل ریٹ پر سپلائی کرتے

ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں بھاری ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات کم ٹیکس ادا کرنے کے لیے اکثر مڈل اور ہائی لیول پہ چلنے والے سکولوں کے مالکان اپنے سکولوں کو پرائمری تک ہی رجسٹرڈ کرواتے ہیں۔ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سکولز میں غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی بہت توجہ دی جاتی ہے۔ بچے کھیل کود کے مقابلوں کے ساتھ ساتھ نعت، شعروشاعری، تقاریری وتصاویری مقابلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں بلکہ میوزیکل شو، گانا بجانا اور اداکاری، ڈانس بھی سکول کے سالانہ نتائج کے فنگشن پر بچوں سے ہی کروائے جاتے ہیں۔

یہ سب صرف میٹرک یعنی دسویں جماعت تو ٹھیک ہے مگر اس سے آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت کم بچے بچیاں جاسکتے ہیں۔ اس میں اکثر تو معاشی مجبوریوں کی وجہ سے روزگار میں لگ جاتے ہیں اور لڑکیاں شادی کے بعد سسرال چلی جاتی ہیں لیکن کچھ خوش نصیب لڑکیاں تو کالج جانے میں بھی کامیاب ہوجاتی ہیں۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں سب کے لیے کالج کا انتخاب اور پھر مضامین کا انتخاب بہت مشکل ہوتا ہے۔ اکثر بچے دسویں جماعت میں بہت کم نمبر حاصل کر کے امتحان پاس کر لیتے ہیں جس کے باعث انھیں کالج میں داخلہ لینے کے لیے کئی کالجز میں الگ الگ میرٹ لسٹ ہونے کی وجہ سے دو یا تین داخلہ فارم بھر کے جمع کروانا پڑتا ہے۔ پھر جس میں بہت کم میرٹ ہو اس میں داخلہ ملتا ہے۔ عموماً اچھی آبادیوں کے کالج میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ اب تو کالجوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ ایک ایم این اے صاحب کو پچیس سال حکومت میں رہنے کا موقع ملا تو انھوں نے کئی (ڈگری) کالج تمام آبادیوں میں بنوا دیے ہیں مگر ان کالجز میں ہر کالج میں عمارت تو موجود ہے مگر فرنیچر اساتذہ اور تجربے کے لیے لیبارٹریز کا فقدان ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کالجز میں (ایریا) جگہ بھی بہت کم ہے۔ اکثر اوقات تو کالج میں لیکچرار درخت کے نیچے ہی

کلاسوں میں لیکچرز دیتے ہیں، جہاں پر درخت پر بیٹھے کوّے اکثر طلبا کے سر پر یا یونیفارم پر بیٹھ کر دیتے ہیں مگر مشکلات کے باوجود تعلیم تو حاصل کرنا ہی ہے۔

کالج میں مضامین کے انتخاب کے وقت کبھی کبھی ان آبادیوں کے بچوں میں سے کوئی بچی یا بچہ میڈیکل یا اعلیٰ ٹیکنیکل ڈگری حاصل کرنے میں شاید ہی کامیاب ہوا ہو؟ ۱۹۹۰ء کی دہائی تک پورے بیس پچیس ہزار کی آبادی میں ایک آدھ ہی لڑکا بی۔اے پاس ہوا کرتا تھا۔ وہ بھی سادے مضامین آرٹس اور اسلامیات اختیاری وغیرہ کے ساتھ۔ کیونکہ دسویں تک انھیں شہری علاقوں میں اسلامیات اور زراعت ہی پڑھائی جاتی تھی اور کبھی کسی سکول میں دسویں جماعت میں سائنس تو پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی ،اس لیے میڈیکل میں جانے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ البتہ پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں میں اب کمپیوٹر کی تعلیم کا کہیں کہیں رواج ہو گیا ہے اور مین علاقوں میں کمپیوٹر ٹریننگ سینٹرز بھی بنائے گئے ہیں مگر یہاں بھی بنیادی تعلیم MS.Window ، Word وغیرہ ہی دی جاتی ہے۔ یہاں تین ماہ میں تین ہزار روپے فیس میں کمپیوٹر سکھایا جاتا ہے۔ البتہ کچھ لڑکے شہر کے اچھے علاقوں میں موجود پولی ٹیکنیکل کالجز کا رُخ بھی کرتے ہیں جہاں تین سالہ ڈپلومے بھاری فیسوں کے ساتھ کروائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی عملی تجربوں کے بغیر ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں کہ جوان ڈپلوما کے بعد عملی تجربہ بھی حاصل سکیں۔ لڑکیاں تو صرف آرٹس میں ایف۔اے یا بی۔اے پاس کر لیتی ہیں، وہ بھی اسلامیات، نفسیات، ایجوکیشن۔ بہت کم بچیاں سیاسیات پڑھتی ہیں۔ اکنامکس تو لڑکوں کے بس سے بھی باہر ہے بس کسی نے بہت تیر مارا تو B.Com یا I.Com کر لیا مگر اسے بھی صرف نوکری کے لیے پڑھایا گیا ہوتا ہے۔ آتا جاتا کچھ نہیں۔ اس لیے انٹرن شپ کے لیے اچھے بینکوں میں مواقع نہیں مل پاتے جبکہ نوکری تو دور کی بات ہے۔

زیادہ تر لڑکیوں کو بی۔اے یا ایف۔اے کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ٹیچنگ کورس گھر بیٹھے سی۔ٹی یا پی ٹی سی کرنے کا موقع مل جاتا ہے تاکہ وہ صرف تعلیم کے شعبے میں ہی جاسکیں۔اب لڑکیاں ایم۔اے یا ایم۔ایڈ بھی کر رہی ہیں۔لڑکے عام طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ شاید ہی کوئی لاکھوں میں ایک بی۔اے کے بعد قانون (لاء) کی تعلیم حاصل کر کے وکیل بننے میں کامیاب ہو سکے۔جس کے گھر والے اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکیں یا وہ خود پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوئی ملازمت یا کاروبار کر رہا ہو اور وہ اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کر رہا ہو۔

مذہبی یا دینی تعلیم

جو بچے سکولز میں نہیں چل سکتے ، نہ ہی ان کا رجحان کسی ہنر سیکھنے کی طرف ہوتا ہے، وہ کوئی بھی کام نہیں سمجھتے انھیں ماں باپ دینی تعلیم حاصل کرواتے ہیں۔اس مقصد کے لیے ہماری آبادیوں میں بہت سے دینی مدارس بچوں اور بچیوں کے لیے الگ الگ قائم کیے گئے ہیں جہاں پر بچوں کو ناظرہ کے ساتھ ساتھ حفظ بھی کروایا جاتا ہے جس کا مقصد ماں باپ کو جنت میں لے جانا بتایا جاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے معاشرے والوں کی زبان بند رہے اور لوگ یہ سمجھیں ان کا بچہ دنیاوی نہ سہی دینی تعلیم تو حاصل کر رہا ہے۔ثواب کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والوں کی آخرت بھی سنور جائے گی۔ ایسے مدارس کے علاوہ مساجد میں بھی تعلیم کا سلسلہ چل رہا ہے جہاں ناظرہ تعلیم (قرآن) عربی زبان میں تو ہر بچے کے لیے فرض ہے چاہے وہ سکول پڑھے یا نہ پڑھے، عربی میں قرآن مجید پڑھنا اسے لازمی پڑھایا جاتا ہے جس کا مطلب وہ کبھی نہیں سمجھ سکتا اس پر عمل کیا کرے گا لیکن بچیوں کو عام طور پر گھر کے اندر یا باہر گلی محلے میں قرآن پڑھانے والی خاتون

کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ جہاں وہ سکولز سے آنے کے بعد یا جانے سے پہلے صبح اور شام دو وقت باقاعدگی سے دینی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔لڑکوں کو باقاعدگی کے ساتھ امام مسجد کے پاس ناظرہ قرآن کی تعلیم کے لیے بھیجنا ضروری ہوتا سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ان پسماندہ معاشروں میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے مقامی طور پر ہی بندوبست کیا جاتا ہے کیونکہ دوسرے ممالک تو دور کی بات ،معاشی حالات کی وجہ سے دوسرے شہروں میں بھی جا کر ہمارے ہاں بچے یا بچیاں تعلیم حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

فنی تعلیم یا ہنر سیکھنا

زیادہ تر بچے بچپن میں سکولز سے بھاگ جاتے ہیں۔ان کے سکول چھوڑنے کی وجہ یا تو ماسٹر کی مار یا پھر والدین کی عدم توجہی کی وجہ ہوتی ہے۔کچھ کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جانے کی وجہ سے انھیں عام طور پر گلی محلے کے قریبی درزی،مکینک یا کسی اور ہنر سے منسلک استاد کی شاگردی میں دے دیا جاتا ہے۔وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے نہ صرف مشین چلانا سیکھ جاتا ہے بلکہ مشینوں، گاڑیوں کو بھی ٹھیک کرنا سیکھتا ہے جسے روزانہ دس، بیس یا پچاس روپے اُجرت یا خرچہ استاد دیتا ہے۔سارا دن استاد کی ڈانٹ اور فنی تعلیم کے ساتھ ساتھ استاد کے گھر کا سودا سلف لانے، بچوں کو سکول چھوڑنے اور بنک میں بلز جمع کروانے کے علاوہ ہوٹل سے چائے لانے کے کام بھی سکھائے اور کروائے جاتے ہیں۔ یہ سارے فن اس کی فنی تعلیم کا حصّہ سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک فن یا ہنر ٹرکوں پہ نقش ونگار بنانے کا بھی ہے اسے ٹرک آرٹ کہتے ہیں۔ جہاں بچے سالہا سال شاگردی کرنے کے بعد استاد بننے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ڈرائیوری بھی ایک اہم ہنر ہے جس کے لیے بچے کو کسی گاڑی کے ساتھ کنڈیکٹری کرنا

پڑتی ہے تو اسے استاد یا مالک ڈرائیوری بھی سکھا دیتا ہے۔ کچھ پڑھے لکھے بچے جو نویں دسویں میں ہوتے ہیں کبھی فارغ ہو کر کبھی دوران تعلیم وہ کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس کلینک میں کمپونڈری کا ہنر بھی سیکھتے ہیں جس میں ٹیکا لگانا، پٹی کرنا، ڈرپ لگانا، ٹانکے لگانا اور بی۔ پی اور بخار چیک کرنا آ جاتا ہے۔ آج کل کمپیوٹر اور موبائل کا استعمال بھی بہت بڑھ گیا ہے اس لیے جو بچے تعلیم حاصل نہ کر سکیں یا بار بار فیل ہو رہے ہوں تو وہ موبائل ٹھیک کرنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔ کمپیوٹر اور الیکٹرانکس کا سامان ٹھیک کرنے کے ہنر کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ اس لیے بہت سے بچے یہ کام بھی سیکھنے کی کوشش ہیں۔

اس کے علاوہ بچیوں کو تو صرف سلائی کڑھائی کا ہی ہنر فنی تعلیم کی صورت میں ملتا ہے۔ اگر وہ سکولز میں ہوں تو بھی میٹرک تک ہوم اکنامکس کے مضمون میں انھیں کھانا پکانا، سینا پرونا اور بچے پالنا جیسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر اسے سکول نہ پڑھانا ہو تو اُسے محلے میں کسی دست کاری سکول یا کسی خاتون کے پاس سلائی کڑھائی، کروشیے یا تلے کا کام سکھایا جاتا ہے۔

ہماری کہاوتیں

ہمارے ہاں شہروں میں بہت سے لوگ دیہی علاقوں سے ہجرت کر کے روٹی روزی کمانے کے لیے قریبی شہروں میں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ چالیس، پچاس سالوں میں شہری ماحول اختیار کرتے ہیں پھر شہری ماحول میں رچ بس جاتے ہیں۔شہری ماحول اختیار کرنے کے ساتھ ہی ان کی زبان،لباس،خوراک سب تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے آبائی علاقوں کا سارا ماحول بھول جاتے ہیں اگر بھول نہ سکیں تو کم از کم بدل لیتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے بچے تو لازمی اپنا ماحول تبدیل کر لیتے ہیں۔لیکن ایک چیز جو ہمیشہ انھیں نسل در نسل یاد رہتی ہے وہ ہے ان کے اپنے آبائی علاقوں کی مختلف کہاوتیں، مثلیں جو وہ اپنی علاقائی زبان میں اکثر و بیشتر غصے میں، مذاق میں یا کسی کو کچھ یاد کروانے کے لیے بولتے ہیں تو ان کے آبائی علاقوں کا پتا چلتا ہے۔مثلاً کچھ کہاوتوں کا میں ذکر کرنا چاہوں گی:

''ہر کدے آؤ''

کسی کو ویلکم کرتے وقت جب کوئی شادی یا خوشی پر گھروں میں آتا ہے تو ہندکو بولنے والے لوگ کہتے ہیں۔اسی طرح ''پخیر راغلے'' پشتون کے الفاظ ہوتے ہیں۔

''ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا''

اردو کی کہاوت ہے۔آج کل کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں۔جس کا مطلب ہے کام نہیں آتا تو ماحول کا بہانہ کر رہے ہو۔

''ماں نہ سوئی ماسی سوئی''

یعنی اگر خالہ آپ سے پیار کرتی ہے آپ کی تکلیف میں مدد کرتی ہے تو ماں نہ بھی ہو اس کا حق اس کی بہن ادا کرتی ہے تو کہتے ہیں جتنی تکلیف ماں نے پیدا کرتے ہوئے اٹھائی ہوگی ایسا سمجھیں کہ ماں نے نہیں خالہ نے وہ تکلیف اٹھالی ہے اور آپ سے پیار کر رہی ہے۔

''ہائے ماڑے مقدر و کتھے ویکھدے سو''

عام طور پر اپنے نصیبوں کو کوسنے کے لیے خواتین بولتی ہیں کہ ہمارے مقدر یا نصیب ٹھیک نہیں ہیں ہمارے لیے کہاں لکھے گئے ہیں۔

''ماواں ٹھنڈیاں چھاواں''

جب کسی کی ماں کا انتقال ہو جائے یا وہ اپنی ماں سے دور ہو تو آہ بھر کے کہتے ہیں کہ ماں کا سایہ بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔

''یاراں نال بہاراں''

یہ کہاوت تو دوستوں کی اہمیت کے سلسلے میں بولی جاتی ہے کہ اگر بندے کے ساتھ کسی بھی مصیبت میں دوست کھڑے ہوں تو وہ مصیبت نہیں رہتی یا وہ اکیلا نہیں ہوتا دوستوں کے ہوتے ہوئے۔

''دے لاگڈ یدل نہ ورزی چی غولی کی لائی تکنگ دے ربا''

جب کوئی بندہ کوئی کام صحیح طرح نہ کر سکے یا اس کام کے بارے میں علم نہ ہو تو یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں۔ یہ پشتو زبان کی کہاوت یا مثل ہے جس کا مطلب ہے ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔

''کلے تے وڈا ہو جائے تے دند نہیں گندے دے دیہاڑے گنے ہوندے نے''

اس کا مطلب ہے کہ جب کوئی آپ سے ہوشیاری کر رہا ہو اور آپ کے سامنے بڑا ہو تو اس کی ہر ہوشیاری اور عادت سے آپ واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ پھر اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ جملہ بول کر کہ میں تمھاری ہر چال سمجھتا ہوں۔

''آ پڑے سر تے پئی اے تد پتا چلا یا دے کہ کتنے ویہاں دا سو ہونداا ے''

عام طور پر جب کوئی اور کما رہا ہو تو اخراجات سوچ سمجھ کر نہیں کیے جاتے۔ خصوصاً ماں باپ یا سربراہ لیکن جب خود ان کی جگہ بندہ آتا ہے اور فیملی کی حیثیت سے سربراہ کی ذمہ داری سنبھالتا ہے تو ایک ایک روپیہ سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہے۔ پھر اسے کہتے ہیں کہ اب تمھیں علم ہوا کہ سو میں کتنے بیس روپے ہوتے ہیں یا کتنے 20 کے نوٹ ہوں تو 100 بنتا ہے۔اسی طرح پشتونوں کے ہاں یہی بات سمجھانے کے لیے اس محاورے کو پشتو میں یوں بولتے ہیں ''سیر نا سونا جوڑی گی''۔ ہمارے ہاں دوسروں کو سمجھانے کے لیے کہتے ہیں کہ اب تمھیں آٹے دال کا بھاؤ پتا چلا ہے کہ ایک کلو میں کتنی روٹیاں بنتی ہیں۔ کیونکہ جب ہم کام کرتے تھے تو تم فضول خرچی کرتے تھے۔اب خود کماتے ہو تو ایک ایک روپے کا حساب کتاب کرتے ہو۔

''سر دے سائیں نال بادشاہی ہوندی اے''

یعنی خواتین کے حوالے سے یہ کہاوت عام مشہور ہے کہ جب تک عورت کا شوہر زندہ ہوتا ہے گھر اور پورے خاندان میں وہ بااختیار ہوتی ہے۔اس کی مرضی سے فیصلے ہوتے ہیں۔ جب اس کا شوہر نہ رہے تو اس کی کوئی نہیں سنتا۔

''کھری پچھے مت ہوندی اے''

یہ محاورہ نوجوان لڑکیوں کی مائیں انھیں سمجھانے کے لیے بولتی ہیں کہ کام ٹھیک ٹھیک کرو، ورنہ مرد ویسے ہی کہتے ہیں کہ لڑکیوں یا عورتوں میں عقل کی کمی ہوتی ہے۔ دماغ

کی بجائے پاؤں سے کام لیتی ہیں۔

''کٹی اُنگلی تے نہیں موتر دا''

جب کوئی اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگے اور دوسروں کو نظر انداز کرنا شروع کر دے تو دوسرے لوگ طنزیہ کہتے ہیں کہ آپ تو ویسے ہی اس کی سائیڈ لے رہے ہیں۔ وہ ہمیں ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا ہمیں کچھ نہیں سمجھتا۔

''کنگھا پراندہ لے کر تیسرے دن موڑ آ سیں''

یہ بھی عام طور پر جوان لڑکیوں کو سمجھانے اور کام سکھانے کے لیے مائیں کہاوت کے طور پر بولتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کام کاج کرنا سیکھ لو ورنہ شادی کے چند دن بعد ہی ناراض ہو کر آ جاؤ گی اور سسرال والے کہیں گے کہ یہ بہت نکمی لڑکی ہے۔

''جیسا دیس ویسا بھیس، جیسی ماں ویسی دھی''

یعنی جیسا انسان خود ہوتا ہے، ویسی ہی اس کی اولاد ہوتی ہے۔ خصوصاً بیٹیاں اپنی ماں کا عکس ہوتی ہیں۔ اگر ماں عقل مند ہو گی تو بیٹی بھی ضرور سلیقہ شعار اور سگھڑ ہو گی۔

''ادھی رات آں ادط؛ ح آں د۔نہہ نکلیا وچ ویڑھے''

یہ محاورہ کسی بھی کام میں دیر ہو جائے تو بولا جاتا ہے۔ عموماً خواتین ہی کسی کام کے کرنے میں دیر کریں تو کہتے ہیں کہ ہم تو اپنی طرف سے بہت جلدی یہ کام کر آئی ہیں مگر جب دیکھا تو اس فیصلے کو کرنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔

''ویلے دی نماز تے کویلے دیاں ٹکراں''

یہ محاورہ وقت کی اہمیت کے حوالے سے بولا جاتا ہے کہ جب تک انسان اپنے مقررہ وقت میں کام نہ کر سکے تو اس کو بعد میں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یعنی کسی بندے کی مصیبت میں مدد کرنا ہو اور وہ مصیبت ختم ہونے کے بعد جا کر مدد کرے تو اس مدد سے

اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

''اپنا مارے تے چھاویں سٹدا اے''

یہ اپنے عزیز رشتہ داروں کی اہمیت بتانے کے لیے بولا جاتا ہے۔عموماً جب بیٹوں کے رشتے خاندان میں طے کرتے ہیں تو اس کو سمجھانے کے لیے رشتے خاندان میں کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ بیٹی جب وہ تمھارے ساتھ زیادتی کرے گا تو پھر بھی تمھارا خیال رکھے گا۔

''تو کے ضد کرنا ایں میرا دادے پوترا تے نہیں اے''

یہ خصوصاً اس وقت بولتے ہیں جب کوئی دوست یا بھائی وغیرہ آپ سے ضد اور دیر کرے تو بولا جاتا ہے کہ عموماً چچازاد کو دادے پوترا کہتے ہیں کہ آپ سے اس لیے ضد کرتا ہے کہ اس نے آپ سے دادا کی جائیداد میں حصہ لینا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بولا جاتا ہے کہ ''تیری میرے نال کیہڑی جا سانجھی اے'' یعنی تمھاری کون سی میرے ساتھ جائیداد اکٹھی ہے جسے ہم نے بانٹنا ہے کزنوں کی طرح یا بہن بھائیوں کی طرح ہم حصّہ دار تو نہیں ہیں کہ تم میرے ساتھ ضد اور لڑائی کر رہے ہو۔

''آملے دا کھدا تے بزرگاں دا آکھیا بعد وچ سواد دیندا اے''

آملے کا اچار عموماً ہمارے ہاں کھایا جاتا ہے لیکن آم، گاجر، لیموں وغیرہ کی طرح فوراً اس کو کھانے کا مزہ نہیں آتا مگر آملے کا اچار وقت گزرنے کے بعد آپ کا ہاضمہ درست کرتا ہے اور آپ جب ڈکار لیتے ہیں تو آپ کو مزہ آتا ہے۔ذائقہ تازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب بڑے بزرگ اپنے تجربے کی بنیاد پر کوئی مشورہ یا نصیحت کرتے ہیں تو ہم نہیں سمجھ سکتے مگر جب عملی طور پر اس کا فائدہ یا نقصان اٹھاتے ہیں تو ہمیں سمجھ آتی ہے۔

''نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملاں تے خطرہ ایمان''

اس کا مطلب اس طرح لیا جاتا ہے کہ کوئی بندہ خود سمجھدار تجربہ کار نہ ہو تو اس کا مشورہ یا بات بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔ وہ آپ کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

''بھینس کے آگے بین بجانا''

جب کسی کو سمجھا رہے ہوتے ہیں اور وہ نہ سمجھ رہا ہو تو پھر کہتے ہیں کہ اس بندے کے سامنے بات کرنا فضول ہے۔ اسی طرح جب کوئی بہت ہی ناسمجھ ہو یا آپ کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ بات کو نہ سمجھے تو کہتے ہیں۔

''ڈورے آگے گاڑاں تک اندھے اگے نجڑاں''

اس بندے کو سمجھانا ایسا ہے کہ جیسے کسی اندھے کے سامنے کوئی ناچے تو اس کو نظر نہیں آتا اس طرح بہرے کے سامنے گانا گائیں گے تو وہ سن نہیں سکتا تو سمجھے گا کیا؟ بیوقوف بندے کے سامنے بات کرنا فضول ہوتا ہے۔

''شاہ جاڑیں تے راہ جاڑیں'' یا انگار جاڑیں تے لوہار جاڑیں''

دونوں کہاوتیں ایک جیسی ہیں ایک جیسا مطلب نکلتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ کہاوت لوگ اس وقت بولتے ہیں جب وہ کسی کو مشورہ دیں اور وہ عمل نہ کرے تو اسے غصّے میں کہتے ہیں تم اپنی مرضی کرتے ہو تم خود اس کے نتیجے کے بھی ذمہ دار ہو گے۔

''کھاوے ٹبرے سودے قبر''

یہ کہاوت عام طور پر اس بندے کے لیے بولتے ہیں جو کوئی غلط کام کر رہا ہو تو اسے سمجھانے کے لیے کہتے ہیں کہ تم تو اس وقت یہ غلط کام کر لو گے اور تمھاری فیملی کو فائدہ بھی ہو جائے گا مگر اس کا عذاب اور گناہ تمھیں بھگتنا پڑے گا جواب دہ تمھیں ہونا پڑے گا۔

''نہ منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا''

یہ محاورہ عام طور پر ہم کسی بھی بدصورت بندے کے بارے میں جب غصے سے

بات کر رہے ہوتے ہیں اور اس کے سامنے بھی جھگڑے میں بولتے ہیں کہ نہ تم خوبصورت ہو نہ تمھارا اور کوئی کام عمل اچھا ہے۔

''جس گھر بیری ہوئے وٹے تے آندے نے''

یعنی ہم کسی لڑکی والے گھر رشتہ لینے جائیں تو ان سے رشتہ پوچھتے ہیں اور اگر وہ کہیں کہ کیوں آئے ہو۔ فلاں بندہ بھی آیا تھا مقصد سمجھانے کے لیے کہ ہم لوگ تمھاری بیٹی کا رشتہ مانگنے آئے ہیں تو انھیں کہتے ہیں اگر گھر میں بیٹی ہو تو رشتہ مانگنے والے تو آتے ہی ہیں۔

نظر اتارتے وقت عام طور پر یہ محاورہ پڑھا جاتا ہے۔

نظر بھناں اپنے پرایاں دی- بھوتاں پریاں دی، مامے چاچے دی- محلے والے دی۔ تین دفعہ یہ دہرایا جاتا ہے۔

''نکیاں پوتاں وڈھے بھوت چھلے''

یعنی عام طور پر جب بچے بڑوں کو چکر دے رہے ہوں تو بڑے سمجھ رہے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بچے اب بڑوں کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔

''کنوں پرت حرامی ایں''

جب کوئی بندہ بہت زیادہ غلط کام یا شیطانیاں کر رہا ہو تو اسے روکنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ تم تو حد سے بڑھ کے غلط کام کر رہے ہو یہ جملہ بولا جاتا ہے۔

''نہاتے دھوتے ہوئے رہ گئے آں''

یہ محاورہ عام طور پر اس وقت بولا جاتا ہے جب بندے نے کسی پروگرام کی بڑی اچھی طرح تیاری کر رکھی ہو اور وہ پروگرام ملتوی ہو جائے۔ ہمارے گاؤں میں خواتین بہت مصروف ہونے کی وجہ سے بہت کم نہاتی اور تیار ہوتی تھیں۔ سارا سارا دن گھاس کاٹنے،

جنگل سے لکڑیاں لانے اور کنویں سے پانی بھرنے میں گزر جاتا پھر جانوروں کی دیکھ بھال بھی کرنا ہوتی ہے اور آگ جلا کے کھانا بھی پکانا ہوتا ہے۔ ان سارے کاموں میں ان کے گورے چٹے ہاتھ پاؤں کو ہر وقت کالا کر رکھا ہوتا تھا اور جب بھی گاؤں میں کوئی شادی ہونے والی ہوتی ہے اور مہینہ پندرہ دن قبل اس کے دن طے ہو جاتے تو تمام لڑکیاں اور خواتین اس دن روزانہ ہاتھ منہ دھوتی نہاتی اور صاف ستھری ہونے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں اور گھنٹہ گھنٹہ پانی والی جگہ (کسی نالہ) کے کنارے پتھر لے کر اپنے پاؤں سے میل اتارتی رہتی ہیں۔ کئی مہینوں کی گندگی یا میل ایک آدھ ماہ میں تو صاف نہیں ہوتی اور آخری دن جب اس کی شادی کی کوئی رسم مہندی وغیرہ مقرر ہوتی ہے تو اس گاؤں میں کوئی فوت ہو جائے تو شادی ملتوی کر دی جاتی ہے یا پھر چپ چاپ ڈولی رخصت کر دی جاتی ہے اور مہمانوں کو منع کر دیا جاتا ہے شادی کا کھانا ماتم کے گھر بھیج دیا جاتا ہے تب یہ کہاوت بولی جاتی ہے کہ فلاں فلاں کی شادی میں ہم نہا دھو کر بھی شرکت نہ کر سکے۔

''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے''

یہ کہاوت تو ویسے ہی اردو زبان کی ہے مگر ہمارے ہاں اسے اپنی زبان میں اکثر اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی بندہ پیار کی زبان نہ سمجھے تو اسے غصے اور ڈانٹ سے سمجھاتے ہوئے بولتے ہیں۔

''سر سلامت ہوئے تو جوتیاں دا کال نہیں ہوندا''

عام طور یہ کہاوت اس لیے بولی جاتی ہے جب کسی کو کسی رشتہ یا نوکری وغیرہ نہ ملے تو اسے تسلی دینے کے لیے کہتے ہیں تم سلامت ہو تو نوکری یا رشتوں کی کمی نہیں ہوگی۔

''مطلب ہویا پورا نے مجھ نے سٹیا بورا''

یہ ایسے وقت میں کہتے ہیں کہ جب سردی میں بھینسوں کے اوپر گرم بوری وغیرہ

ڈال دی جاتی تھی اور ایک دو ماہ بوری کو اوپر اوڑھے رکھتے ہیں لیکن جیسے ہی موسم گرم ہوتا ہے تو وہ اسے گرا دیتی ہے یعنی جب بھی کسی کا اپنا مطلب پورا ہو جائے تو وہ آپ کو یا اس بندے کو بھی چھوڑ دیتا ہے جو اس کے مشکل وقت کے ساتھی ہوتے ہیں۔اس مناسبت سے ایک اور بھی محاورہ بولا جاتا ہے۔

''مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے''

عام طور پر یہ لوگ بے وقوف لوگوں یا غریبوں کو لفٹ نہیں کرواتے/مغرور لوگوں کا جب اپنا مطلب ہو تو پھر ایسے بندے کے پاؤں میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور بندہ بھی ان کو سمجھ کر ایک محاورہ بولتا ہے'' کہ تیرا کوئی کھوتا کیچڑ وچ پھسیا ہوسی'' وہ بھی یہ چیز سمجھ جاتا ہے کہ یہ میرے پاس کیوں آیا ہے۔ براہ راست بولنے کے بعد وہ یہ محاورہ بول کے پوچھتا ہے کہ کیا مسئلہ ہے۔ جب وہ بندہ لمبی چوڑی تمہیدیں باندھے تو اسی صورت میں وہ یہ محاورہ بولتا ہے معذوایا مطلب کی بات کرو۔ نوٹ: معذوایا پشتو زبان کا لفظ ہے۔

''جدو چن چڑھ جاسی تے دنیا دیکھ سی''

یہ عام طور پر ایسے کام کے لیے بولا جاتا ہے جو خفیہ طور پر کیا جا رہا ہو یا اس کی کوشش کی جا رہی ہو کہ وہ مسئلہ یا بات کسی کو پتا نہ چلے مگر ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ چاند نکل آئے اور کسی کو نظر نہ آئے''۔

اسی طرح ایک اور محاورہ ہے کہ:

''اوہ دن ڈوبا جدوں گھوڑی چڑھیا کُبّا''

جب کوئی بندہ کوئی اہم کام کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور اسے نہ کر سکے تو طنزاً یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ بھی ہر مشکل کام تمھارے بس کا نہیں۔

''کے انگلی پچھے دن چھپانا اے''

جب کوئی بہت بڑی بات لوگوں سے چھپائی جارہی ہوتی ہے چاہے وہ صفت ہو یا منفی اور چاہا جارہا ہوتا ہے کہ یہ معاشرے کو علم نہ ہو سکے تو پھر یہ کہاوت سامنے آتی ہے کہ تم سورج کو اپنی انگلی کے پیچھے کیسے چھپا سکتے ہو۔

''نت دیہاڑی راہ ہوئے تے سلوار پلے نہیں لاندے''

یہ کہاوت ہمیشہ اس وقت بولی جاتی ہے جب کسی کام میں کوئی بہت جلدی کررہا ہوتو اسے کہاجاتا ہے کہ بھئی ابھی بہت وقت ہے تم پہلے سے کیوں ایسا کررہے ہو۔

''شیخ چلی والے خواب دیکھدے نے دؤ''

یہ ہم اس وقت کہتے ہیں جب کوئی بندہ بہت سی پلاننگ کررہا ہوتا ہے یا جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے ایسا کروں گا تو ویسا ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔عموماً کوئی بندہ کاروبار، ملازمت یا کسی اور طرح کی خواہش رکھتا ہواور اسے پورا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہوتو یہ کہاجاتا ہے اصل میں شیخ چلی ایک افسانوی کردار ہے جو ہر وقت جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے جو پورے کبھی نہیں ہوتے۔

''منوں کی کمی تھوکواں سے پورا نہیں ہوتی''

جب کوئی بہت بڑا نقصان ہوجائے اور لوگ اس کے لیے تھوڑی مدد دینا چاہیں تو وہ بندے آگے سے یہ کہاوت بولتا ہے کہ میرا نقصان بہت ہے اس سے پورا نہیں ہوگا۔

''واہ پیا پتا چلدا اے یا راہ پیا پتا چل دااے''

یہ ہم اسی وقت بولتے ہیں جب کسی بندے کو آزما لیتے ہیں تو سمجھ آتی ہے اگر وہ ہمارے ساتھ سفر میں کہیں جائے یا پھر مصیبت میں اس کی ضرورت ہوتو ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیسا ہے۔

''اک انار تے سو بیمار''

یہ عام طور پر اس وقت بولتے ہیں جب چیز کم اور امیدوار زیادہ ہوں بھلے کسی ایک لڑکی کے پیچھے بہت سے لڑکوں کے رشتے آ رہے ہوں یا ایک نوکری کے لیے بہت سی درخواستیں ہوں تو کہتے ہیں کہ ایک انار/ چیز ہے اور بہت سے مانگنے والے ہیں۔

''انھاں ونڈے ریوڑھیاں تے مڑ مڑ اپنیاں نوں''

یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی بندے کو اختیار دیا جائے۔ کسی کام کا تو بار بار اپنے دوستوں، رشتہ داروں یا خود کو نواز رہا ہو یعنی سارے فائدے اپنے گھر والوں کے لیے حاصل کر رہا ہے۔

''یا روزی یا نصیب''

یہ ہم جب کوئی بچھڑتا ہے اور اسے پوچھتے ہیں کہ پھر کب ملیں گے تو وہ کہتا ہے کہ جب ہمارا کھانا نصیب میں لکھا ہوگا اکٹھے کھانا کھائیں گے یا ملیں گے۔

''جہیڑے گجدے نے اووسدے نہیں''

اس کا مطلب ہے جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں ہیں یعنی جو آدمی بہت نعرہ بازی کر رہا ہوتا ہے یا دھمکی دے رہا ہوتا ہے وہ ضروری نہیں اس پر عمل بھی کرے گا جو عمل کرتا ہے وہ اس کا اعلان نہیں کرتا۔

عشق محبت اور پسند کی شادی (لومیرج)

امیر زادے اور زادیاں شیشہ پینے پلانے پر ایک دوسرے سے پیار محبت کی باتیں کرتے ہیں یا کسی کلب میں ڈانس پارٹی کے موقع پر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ یونیورسٹی کی کمپاؤنڈ میں دل پشوری کر لیتے ہیں۔

اس طرح ہمارے ہاں عشق، محبت تو بہت ہوتی ہے بہت سے سلسلے شروع ہوتے، کہانیاں بنتی ہیں اور ہمارے پریمی تو ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصوں سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جب بھی کسی لڑکے کو کسی لڑکی سے محبت ہوتی ہ وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کے چاہتے ہیں اور عموماً ان کی محبت کے چرچے زبان زدعام ہونے ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ وقت کے مطابق ہر عشق و محبت کا مختلف انجام ہوتا ہے۔ آج سے بیس، پچیس سال قبل بھی ان علاقوں میں پیار و محبت کا عام رواج تھا مگر سب کچھ چوری چھپے ہوا کرتا تھا۔ یا دور دور سے بھی چاہت کا اشاروں کنایوں میں ہوا کرتا تھا۔ عام طور پر چھتوں پہ چڑھ کے دوسری چھتوں پر کھڑی لڑکیاں لڑکے ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں۔ اکثر خط و کتابت میں شعر و شاعری بھی لکھتے ہیں جس میں ایسے شعر ہوتے ہیں:

خط لکھا ہے خون سے سیاہی نہ سمجھنا
میں تمھارا عاشق ہوں بھائی نہ سمجھنا

یہ شعر اس لیے بھی لکھا جاتا ہے کیونکہ اکثر من چلے عاشق بلیڈ سے ہاتھ یا بازو کاٹ کے خون نکال کے اس سے خط لکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے بازو پر لڑکی کا نام یا پہلا حرف بھی بلیڈ سے لکھ لیتے تھے۔ لڑکیاں بھی لڑکوں کے نام کے پہلے حروف اپنے ہاتھوں پر مہندی سے لکھتی

ہیں اور پوچھنے والوں کو بتاتی ہیں کہ وہ ان کی کسی سہیلی کے نام کا حروف ہے۔ اس کے علاوہ خط و کتابت کبوتروں کے ذریعے نہیں بلکہ پتھر کے ساتھ خط باندھ کے چھت پر سے لڑکی کی چھت پر پھینکتے تھے جو اکثر لڑکی کی بجائے اس کی ماں یا خالہ وغیرہ کے ہاتھ لگ جاتا یا مل جاتا جس سے اس لڑکی اور لڑکے دونوں کا راز فاش ہو جاتا اور پھر ان دونوں کی شامت آ جاتی۔ اگر اس پر نام لکھا ہوا ہوتا تو بندہ پکڑا جاتا تو اس کے گھر جا کر وارننگ دی جاتی تھی اور جیسے ہی لڑکی کے گھر والوں کو اس کے معاشقے کی خبر ہوتی تو اسے گھر بٹھا دیا جاتا اور محلے دار اور عزیز و اقارب کہتے کہ ہم نہیں کہتے تھے کہ بیٹی کو آزادی مت دو، اسے سکول میں نہ ڈالو۔ عشق کے چکر میں پڑ کے خراب ہو گی۔ وہ واقعی خراب ہو جاتی ہے اس کا سکول آنا جانا بند۔ اب صرف اس کو مزید اس لڑکے کے بارے میں سوچنے کا اور بہانے بنا کے ملنے کا وقت مل جاتا یا کبھی کبھی سخت پابندی کی وجہ سے اس کا عشق ختم بھی ہو جاتا تھا۔ لڑکے کے گھر والے ان سے معذرت کر لیتے اور اپنے بیٹے کو سمجھانے کا وعدہ کر لیتے تھے۔ اس کے بعد لڑکی کا جلد از جلد کہیں اور رشتہ طے کر دیا جاتا۔ اگر وہ لڑکے والے اچھے ہوتے یا لڑکا گھر میں اپنی مرضی منوانے کے قابل ہوتا تو یہ بات آگے بڑھ کے کبھی کبھی شادی کی طرف چلی جاتی مگر بیس فیصد ایسے عاشقوں کا یہ حال ہوتا تھا۔ محبت کے عجیب کھیل ہوتے ہیں نتیجہ جب نکلتا ہے عاشق فیل ہوتے ہیں۔ اب ان دونوں میں اگر بات بہت آگے بڑھی ہوتی یا دونوں بہت زیادہ جڑے ہوئے ہوتے ہیں خط و کتابت کے علاوہ ملاقاتوں کا بھی سلسلہ شروع ہوا ہوتا ہے تو پھر ان کے پاس دو ہی راستے ہوتے جن میں ایک یا وہ دونوں بھاگ جاتے اور کسی دوسرے شہر میں جا کر کورٹ میرج یا قانونی شادی کر لیتے تھے یا پھر خودکشی وغیرہ کی کوشش کر کے گھر والوں کو منانے کی کوشش کرتے تھے۔ اکثر معاملوں میں لڑکیوں کی دوسری جگہ شادی ہو جاتی تھی اور لڑکے سگریٹ نوشی کے علاوہ چرس اور ہیروئن تک کے نشے کے عادی

ہو جاتے اگر وہ واقعی اس لڑکی سے پیار کرتے ہوتے اگر وقت گزاری کا سلسلہ ہوتا تو پھر وہ نئی لڑکی کے چکر میں پڑ جاتے تھے مگر لڑکی بے چاری دوسرے لڑکے کے ساتھ بیاہ کے جاتی ہے تو وہ سب کی نظروں میں معشوق بھی ہوتی ہے اور جلدی جلدی وہ دوسرے گھر یا لڑکے کو نہیں اپنا سکتی بعد میں ایک دو بچوں کی ماں بننے کے بعد اسے پیار ہو ہی جاتا ہے شوہر سے مجبوری میں بھی کبھی وہ طلاق بھی لے لیتی ہے، بہت کم اسے واپس آنے کے بعد پھر سے اپنایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر معاملات میں پیار محبت کرنے والوں کو مواقع ملتے اور ان کا جنسی ملاپ ہو جاتا ہے تو ان کے پیار کی نشانی کو یا تو جا کر کسی نا تجربہ کار ڈاکٹر، نرس وغیرہ سے ضائع کروایا جاتا تھا یا پھر وقت زیادہ گزر جانے کے بعد پتا چلنے پر اسے پیدا کروا کے چوری چھپے گلا گھونٹ کے مار دیا جاتا تھا اور اس طرح پیار محبت کا نتیجہ کہیں کہیں کچرے کے ڈھیر یا نالے میں مردہ حالت میں ملتا۔ اس طرح کے واقعات آئے دن سننے میں آتے تھے گلی محلے کے بچے بھاگ بھاگ کے گھر آ کے ماؤں کو بتاتے تھے کہ فلاں جگہ لوگ اور پولیس اکٹھے تھے ایک بچے کی لاش ملی ہے جو عموماً لڑکا ہوتا تھا۔

لہٰذا آج کل شعور میں اضافے اور منصوبہ بندی کے طریقوں کی سہولیات ملنے کی وجہ سے بہت کم پیار محبت کے نتیجے میں قتل و غارت ہوتی ہے اور ماں باپ بھی اب اپنے بچوں کی پسند کا خیال رکھنے لگ گئے ہیں۔ پھر خاندان، برادری سے باہر کسی کو عشق، محبت ہو جائے تو بھی ماں باپ اس کو قبول کر کے رشتہ لے جاتے ہیں اب کئی کئی مثالوں میں ایک آدھ بار کوئی بچے کا واقعہ سننے میں آتا ہے وہ بھی اخبار یا ٹی وی میں بلکہ اب تو میڈیا نے بھی اپنا کردار اس حوالے سے مثبت کر دیا ہے وہ بن بیاہی ماں اور باپ کے بچے کو معصوم دکھاتے ہیں اور وہ ماں کی گود میں پل رہا ہے۔ ایسی خبریں بھی دیکھنے کو مل رہی ہیں کیونکہ اب

اس بچے کوسوسائٹی بھی آہستہ آہستہ قبول کرنے لگی ہے۔

خط و کتابت یا چاہت کا اظہار تو ہر لڑکا کئی کئی لڑکیوں سے کرتا ہے اور کوئی کوئی لڑکی بھی ایسی ہوتی ہے جس کی پورے محلے میں دھوم یا چرچے ہوتے ہیں اور وہ ایک وقت میں کئی کئی لڑکوں سے دوستی رکھتی ہے اس کے بارے میں سارے لڑکوں کو علم ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات گروپس میں اس کے گھر کے قریب کھیت ہوتے اور باری باری آ کر اسے ملتے ہیں پھر ایک دوسرے کو مصالحے لگا کر شیئر بھی کرتے ہیں۔ اس موقع پر وہ ایک دوسرے کو جب خط لکھتے ہیں تو اس طرح سے شعر خط میں لکھتے ہیں:

چاندنی چاند سے ہوتی ہے ستاروں سے نہیں
محبت ایک سے ہوتی ہے ہزاروں سے نہیں

پیار محبت کے علاوہ بھی پسندی کی شادیوں میں کوئی کوئی کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ زیادہ تر فیملی میں ہی کزن وغیرہ کا آنا جانا ہوتا ہے۔ اسی سے ماں باپ کی بھی خواہش ہوتی ہے اور بچوں کے بھی ذہن مل جاتے ہیں نہ بھی ملیں تو عموماً لڑکے اپنے ماں باپ کو اپنی مرضی بتا دیتے ہیں کہ فلاں خالہ، چچا، ماموں کی بیٹی سے شادی کروں گا۔ اس کے علاوہ لڑکیاں بھی محلے میں یا اردگرد ہی اپنی پسند کا سانچہ لے کر گھومتی ہیں جس پہ فٹ آ جائے۔ کبھی بھی ہمارے ہاں کے لڑکے یا لڑکیاں دوسرے پوش علاقوں میں عشق محبت کا سلسلہ نہیں جوڑ سکتے، نہ ہی شادیاں کروا سکتے ہیں۔ انھیں اپنے سے نیچے یا برابر کے گھروں میں ہی جہاں تک نظر دوڑ پاتی ہے وہاں تک نظریں لڑانے کی اجازت ہوتی ہے۔

جہاں پہ گھروں کا ماحول ذرا کھلا ہوتا ہے وہاں پہ لڑکیوں کی اپنے کزنوں یا پڑوسیوں وغیرہ سے ملاقات بآسانی ہوسکتی ہے وہاں پیار محبت کو عملی جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے یعنی جنسی تعلقات بنائے جا سکتے ہیں۔ اگر کبھی بھی کسی دور دراز والے لڑکے سے دوستی

وغیرہ ہوبھی جائے اُس سے میل ملاقات کرنے کی نوبت نہیں آتی اوراس طرح کے ماحول میں انڈین ہندی فلموں کے ڈائیلاگ بھی سننے کو ملتے ہیں۔

ہمیں تو اپنے نے لوٹا غیروں میں کہاں دم تھا
میری کشتی تھی ڈوبی وہاں جہاں پانی کم تھا

یعنی یہ بالکل حالات و واقعات پہ سچ ثابت ہوتا ہے۔عموماً پیار ومحبت کا جھوٹا وعدہ کر کے جنسی تعلقات قائم کر لیے جاتے ہیں پھرلڑکے تو بھاگ جاتے ہیں،لڑکیاں حمل نہیں چھپاسکتیں اوراس میں پیارمحبت کم ہی ہوتی ہے۔لڑکوں کی طرف سے جنسی ملاپ کی خواہش پوری ہونے کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔

لیکن آج کل لڑکیاں لڑکے ان مسئلوں میں نہیں پھنستے وہ کھیل کود اور پڑھنے پڑھانے کے علاوہ ہر وقت ٹی وی دیکھنے کے علاوہ سب سے بڑا کام موبائل پر ایس ایم ایس کر رہے ہیں اوراب زیادہ تر عشق ومحبت بھی موبائل اور ایس ایم ایس پر ہی ہوتی ہے۔ مختلف کمپنیوں کے دوروپے میں گھنٹہ پیکج نے ان کی مالی پریشانی بھی ختم کر دی ہے۔اب وہ کھل کے دل کی بات پہنچا سکتے ہیں۔ پرانے زمانے میں محلے کے ایک آدھ گھر میں پی ٹی سی ایل نمبر ہوا کرتا تھا جس پر سارے محلے کی لڑکیاں اپنے عاشقوں سے کزن بنا کے بات کرتی تھیں۔اکثر دوسرے کمرے میں لگے اضافی فون سے گھر والے ان کی چوری باتیں سن کے عشق کا راز فاش کر دیتے تھے۔مگراب موبائل سروس نے سارے لڑکے لڑکیوں کا کام آسان کر دیا ہے۔خط سے آدھی ملاقات ہوتی تھی موبائل سے پوری بات ہوجاتی ہے اور ملاقات کا وقت بھی مقرر کرلیا جاتا ہے اورلڑکی گھر سے کب نکلی سکول اور ٹیوشن تک کب پہنچی۔

پیار محبت میں ناکامی کی صورت میں

اگر کسی لڑکے کو لڑکی سے پیار محبت میں ناکامی ہوگئی ہوتی تھی تو اسے پہلے سے تو تحفے تحائف بھجوا کے صلح صفائی کی کوشش کی جاتی اگر وہ قبول کر لیتی تو پھر سے سلسلہ شروع۔ اگر نہ مانی تو پھر اس کا حل وہ کسی تعویز دھاگے کرنے والے عالم کے پاس جا کر پوچھتا۔اس لیے وہ اپنے بورڈ پر بڑا بڑا لکھوا لیتے ہیں ''محبوب آپ کے قدموں میں، روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لیے ہم سے رجوع کریں''۔بس اب عاشق صاحب پیر صاحب کے پاس پہنچ کے حساب کتاب کرتے ہیں اوراس کے بدلے میں بہت سی رقم، زعفران، مرغے، بکرے تک پیر صاحب کی نظر کر ڈالتے ہیں اور جو تعویز ملا ہوتا ہے اسے لے کر یا بازو کے ساتھ باندھ لے، اپنی محبوبہ کی گلی محلے کے چکر کاٹنا شروع کرتے ہیں یا پھر اس سے ملاقات کی صورت میں اسے کسی چیز میں گھول کے بھی پلانے کی کوشش کرتے ہیں۔کبھی کبھی ان کے بہت چکر کاٹنے سے لڑکی کو ترس آ جاتا ہے اور صلح کر لیتی ہے یا پھر کھانے پینے کی چیز جو اس کی پسند ہو کھانے کے لیے بھی راضی ہو جاتی ہے تو یہ عاشق اس پیر کے پکے مرید بن جاتے ہیں کہ اس کے تعویز کی وجہ سے کام ہوا اور باقی دوستوں، عاشقوں کو بھی اس پیر صاحب کے بارے میں فخر سے بتاتے ہیں۔اکثر لڑکیاں بھی اپنی پسند سے شادی کرنے کے لیے اپنے محبوب سے کہہ کر تعویز منگوا لیتی تھیں اور اپنے ماں باپ کو پلاتی ہیں کہ وہ مان جائیں اور لڑکے کے گھر والوں کو رشتے کی ہاں کر دیں۔اس کے علاوہ لڑکے اور لڑکیاں پسند کی شادی کرنے کے لیے اپنے خاندانوں کے بااثر افراد کی بھی مدد لیتے ہیں جن کی بات ان کے گھر والے نہیں ٹالتے۔اکثر محلے کی کوئی کھڑ پینچ خاتون ان کے رشتے کو ہونے سے روک دیں گی۔

ہمارے چھابے/ پھیری والے

ہمارے ہاں غریب لوگ جو بڑے کاروبار نہیں کر سکتے وہ زیادہ تر تھوڑے بہت پیسے جمع کر کے محلوں، بازاروں، روڈوں پر چھابے لگا لیتے ہیں۔ کچھ ایک جگہ مستقل طور پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ گھوم پھر کے گلی گلی، محلے محلے میں پھیری لگا کے اپنا سامان فروخت کرتے ہیں۔مختلف قسم کے کاروبار چھوٹے پیمانے پر کرتے ہیں جس میں زیادہ تر فروٹ اور سبزی کے علاوہ دوسری چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں۔آج بھی ہمارے گلی محلوں کے علاوہ مین بازاروں اور مارکیٹوں میں بھی اکثر لوگ ٹوکرے میں سوراخ کر کے رسی اور ڈنڈا ڈال کے ایک دائیں اور ایک بائیں کندھے پر رکھ کے سبزی اور پھل بیچتے ہیں۔گلی محلوں کے ریٹ بہت زیادہ نہیں ہوتے مگر بازار والے یا مارکیٹ والے تو ہمیشہ دوگنا ریٹ پر پھل فروخت کرتے ہیں جس میں زیادہ تر وہ سٹابری، لیچی، بڑے انگور اچھے والے اور کینو ہوتے ہیں جبکہ گلی محلے میں تو غریب آبادیوں کے لیے سبزیاں اور کیلے، مالٹے، آم اور بیر بھی فروخت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک ٹوکری سر پہ رکھ کے پھیری والے بھی سبزی و پھل فروخت کرنے آتے ہیں۔سردیوں میں اکثر پشتون چھابے والے ڈرائی فروٹ، اخروٹ، بادام، خوبانی اور انجیر رکھ کے بڑی مارکیٹوں میں خریداری کرنے والے لوگوں کے آگے مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ اکثر جس جگہ مہنگی چیز بیچ دیتے ہیں پھر وہاں سے آگے پیچھے چلے جاتے ہیں تاکہ جس کے آگے چیز بیچی ہے وہ واپس نہ کرنے آجائے ۔اس کے علاوہ بڑی مارکیٹوں میں پھیری یا چھابے والے بچوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور چائنہ سے درآمد شدہ الیکٹرانکس کا چھوٹا موٹا سامان موبائل کور وغیرہ بھی فروخت کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ

ریٹ بہت زیادہ بتاتے ہیں۔اگر خریدار ماہر ہوتو اصل قیمت اپنا تھوڑا بہت منافع رکھ کے بتا دیتے ہیں۔کبھی کبھی کسی نہ کسی کو الو بھی بنا لیتے ہیں اور دس روپے کی چیز سو روپے میں دے دیتے ہیں۔اس کے علاوہ گلی محلوں میں چھابے اور پھیری والے کپڑے، بیڈکور، برتن تک فروخت کرنے آتے ہیں۔کچھ نئے سامان کو بیچتے ہیں اور کچھ پرانے کے بدلے نیا دیتے ہیں جیسے پرانے کپڑوں کو پھیری والے لے کر اس کے بدلے میں پلاسٹک یا سلور کے نئے برتن دے دیتے ہیں۔اس طرح کباڑ کا کام کرنے والے بھی کباڑ کے بدلے میں پیسوں کے علاوہ کئی چیزیں دے دیتے ہیں۔لوگ اپنے گھر سے ٹوٹے پھوٹے برتن پلاسٹک، لوہا، تانبہ اور جوتے وغیرہ سوکھی روٹیاں پرانے کاغذ اور اخباریں وغیرہ پھیری والوں کو دیتے ہیں۔سائیکل پر بھی پھیری لگا لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں رقم وصول کر لیتے ہیں اور کچھ آج سے کئی سال قبل ان علاقوں میں زیادہ تر خواتین چھابے والی پھیری کرنے آتی تھیں۔

پرانی چیزوں کے بدلے میں مٹی کے پیالے، کپ وغیرہ چھوارے اور دوسری چیزیں خصوصاً چوڑیاں دیتی تھیں۔کوئی کوئی صرف نقد لے کر سامان دیتی تھیں۔وہ مخصوص علاقوں، اندرون پنجاب کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے پکھی واس یا جھگیوں میں رہنے والی عورتیں ہوا کرتی تھیں جو سیاہ رنگ کی اور موٹی موٹی ہوتیں۔سارا سارا دن چھابہ سر پر اٹھا کے منہ میں پان ڈال کے پھرتیں۔بعض جوان پھیری والی خواتین کے ٹوکری کے ساتھ ساتھ بچہ بھی بغل میں اٹھائے ہوتا تھا اور سخت گرمی میں بھی پھیری لگانے کا مشکل کام کرتی ہیں۔کچھ عرصے سے ہم نے انھیں ان علاقوں میں پھیری لگاتے نہیں دیکھا۔شاید بازار اور دوکانوں سے عورتوں کی خریداری کرنے کی شرح بڑھ جانے کی وجہ سے یا ان علاقوں کے مالی حالات بھی بہتر ہو گئے ہیں۔البتہ ایک قسم کے پھیری والے یا چھابے والے آج بھی آواز لگاتے ہیں ردی کاغذ کے بدلے سیسیہ سوکھیاں روٹی کے بدلے پیسہ پرانی جوتیوں

کے بدلے میں پیسہ یہ بھی پنجاب میں کبھی کبھی تو لاؤڈ سپیکر میں کبھی ویسے بھی آوازیں لگا کر ان آبادیوں میں پھیری کرتے نظر آتے ہیں جس پھیری والے سے کبھی ماں یا باپ نے اپنے بچپن میں پتیسہ لے کر کھایا تھا، وہی آج بھی کم وبیش پتیسہ یا چھولے وغیرہ پھیری کر کے بیچتے ہوئے بچوں کے آگے بیچتے ہوئے نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم بڑے بازاروں میں چھابے، پھیری کی بات کریں تو خواتین کے لیے سامان والے موتی بازار میں سوئیاں کانٹے، دھاگے اور بٹن والے چھابے میں بیچتے ہیں۔ اس طرح سبزی منڈی میں تو سارے سبزی والے جن کی دوکانیں نہیں ہوتیں وہ چھابوں میں سبزی سستے داموں فروخت کرتے ہیں۔ نہ انھیں دوکان والوں کی طرح کرایہ ادا کرنا ہوتا نہ ہی بجلی وغیرہ کے بلز کی ادائیگی البتہ چھابہ لگانے کے لیے انھیں دوکاندار یا میونسپلٹی والوں کو ماہانہ تین سو سے ایک ہزار روپے تک ادا کرنا پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ پکی ہوئی شکرقندی، کچالو، پیڑے اور تازہ مچھلی بھی یہ بھی فروخت کرتے ہیں۔ مردوں اور خواتین کی نیچے پہننے والی بنیان اور جرابیں بھی بآسانی ان چھابے والوں سے مل جاتی ہیں۔ چنا چاٹ کے لیے ابلے چھولے لیموں نچوڑ کر کاغذ کے ٹکڑوں پر رکھ کر پانچ سے دس روپے میں فروخت کرتے ہیں۔ ہر چھابے والا اتنا ہی سامان لیتا ہے جتنا وہ اٹھا سکے اور اس کی رقم بھی ہو اسے سامان شام تک ختم کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر کچھ مزدور بھی خالی ٹوکرے لے کر غلہ منڈیوں میں اور دوسرے بازاروں میں پھرتے ہیں اور لوگوں کا سامان وغیرہ اٹھا کے تھوڑی بہت اجرت لے کر گاڑیوں تک یا مارکیٹوں یا تانگے کے سٹاپ تک پہنچا دیتے ہیں۔

جھگڑے اور ان کے حل

ان آبادیوں میں مکانات ساتھ ساتھ جڑے ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ آپس میں جہاں مددگار رہوتے ہیں وہاں پر مختلف وجوہات کی بنا پہ جھگڑے بھی ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ پھر انھیں مختلف طریقوں سے حل کر لیا جاتا ہے لیکن اس دوران گزرنے والا وقت جہاں پہ دونوں فریقین کو بہت اذیت دیتا ہے وہاں یہ بہت سا مالی نقصان بھی پہنچا دیتا ہے جس سے وہ لوگ بعض اوقات اپنی زندگی کی ساری جمع پونجی تک کھو دیتے ہیں۔ زیادہ تر جھگڑے بچوں کے سر پہ ہوتے ہیں بچے آپس میں کھیلتے کھیلتے لڑ پڑتے ہیں یا ایک دوسرے کو مار دیتے ہیں اور ان میں سے کسی کا بڑا دوسرے کو تھپڑ مارنے یا ڈانٹ ڈپٹ کر دے تو پھر دونوں خاندانوں کی لڑائی شروع ہو جاتا ہے۔خواتین ہمیشہ بچوں کے سر پہ جھگڑے کا آغاز کرتی ہیں پھر مرد بھی اس میں کود پڑتے ہیں۔ پھر بات بڑھ جاتی ہے اور بعض اوقات تھانہ کچہری تک پہنچ جاتی ہے۔ دونوں فریقین کی طرف سے کراس پرچے بھی ہو جاتے ہیں۔کبھی کبھی پولیس خود پیسے لے دے کر صلح کروا دیتی ہے تو کبھی جرگے میں محلے کی سطح پر فیصلہ کوئی لوکل کھڑ پینچ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ عام طور پر جن گھروں میں جوان لڑکیاں ہوتی ہیں اور ان سے محلے کے لڑکے راہ و رسم بڑھا لیتے ہیں۔ جب ان کی دوستیوں کا لڑکی کے گھر والوں کو پتا چلتا ہے تو وہ لڑکے کو مار پیٹ کر دیتے ہیں جس سے جھگڑا بن جاتا ہے۔ پھر بات بگڑ جاتی ہے یا تو لڑکا بھی جوابی کاروائی میں مار پیٹ کرتا ہے یا پھر اس لڑکی سے روابط مضبوط کر لیتا ہے اور میل ملاپ کا سلسلہ بھی تیز کر دیتا ہے۔اور پھر لڑکی والے اس کے خلاف قانونی کارروائی

کرتے ہیں اور اکثر اوقات یہ کیس حدود کیس میں بدل جاتے ہیں اور لڑکے کو جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے اور پہلے پہل تو لڑکی کا باپ بھائی یا چاچا ماما اس لڑکے کو قانونی مار دینے کی بجائے خود ہی جان سے مار ڈالتے تھے پھر اس کا کیس بنتا تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں چوری کی نیت سے آیا تھا ہم نے اپنے دفاع میں اسے مار ڈالا۔ایسے جھگڑوں میں اگر لڑکے کی فیملی مضبوط ہوتو انھیں سزا دلوادی جاتی اور اگر لڑکے کا تعلق کسی غریب گھرانے سے ہوتا تو پھر معاملے کو جرگے میں کچھ لین دین کر کے ختم کر دد یا جاتا تھا۔اکثر لین دین کے معاملے میں جب کسی سے قرض لے لیا جاتا ہے اور واپس نہیں کیا جاتا اور قرض خواہ تقاضے کر دیتا تو اس موقع پہ بھی ہاتھا پائی جاتی اور جتنا قرضہ نہیں لیا ہوتا اس سے دوگنا زیادہ اس مسئلہ کے حل میں پولیس والوں کو دینا پڑ جاتا ہے۔ پہلے پہل تھانہ کچہری میں خواتین کو بالکل نہیں جانے دیا جاتا تھا چاہے فیملی کورٹ یا ثالثی کے ہی جھگڑے کے سلسلے میں کیوں نہ جانا پڑتا اس کے گھر کے مرد اسی جگہ جاتے ہیں اور سارا معاملہ ہی طے کرتے تھے مگر اب خواتین باشعور نہ بھی ہوں اتنی آزاد ہوگئی ہیں کہ وہ فوراً درخواست لے کر تھانے چلی جاتی ہیں اور اکثر ان کے مرد بھی خود انھیں اس عمل پہ اُکساتے ہیں کیونکہ ان کے پاس وقت نہیں ہوتا دوسرے خواتین کی درخواست پہ ایکشن جلد لیا جاتا ہے۔مشرقی روایات کی وجہ سے خواتین کو پولیس والے بھی تھوڑا بہت احترام دیتے ہیں البتہ محلے کی سطح پر جرگوں میں مردوں کے ساتھ یا سامنے ابھی تک خواتین نہیں آسکتیں۔وہ الگ پردے میں جس کو جرگے کا منصف بنایا گیا ہوتا ہے پیسوں کا لین دین کریں۔ اگر ان کا جھگڑے میں براہ راست عمل دخل ہو ورنہ ان کے مرد جو بھی فیصلہ کر کے یا ویسے ہی صلح کرآئیں عورتیں اسے من وعن مان لیتی ہیں۔

اس کے علاوہ جھگڑے کے حل کے لیے پولیس والے رپورٹ درج بھی کر لیں

تب بھی فریقین کو عدالت جانے کی بجائے جرگے میں صلح کا ہی مشورہ دیتے ہیں لیکن وقتی طور پر یہ وہ دونوں سے پیسے لینے کے لیے سخت سے سخت قانونی دفعات لگا کر دونوں کے بندے پکڑ لیتے ہیں۔ پھر انھیں ڈرا دھمکا کے جیل بھجوانے کا کہہ کے بھاری رقم وصول کر لیتے ہیں اور انھیں منہ مانگی رقم مل جاتی ہے۔ ان کی ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہوتی ہیں جو زیادہ رقم دے جیسے کہتے ہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

جھگڑے کی کوئی بھی وجہ یا چاہے لین دین، لڑکی کا چکر یا بچوں کا جھگڑا بعض اوقات یہ بہت بڑا مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔ ذات برادری ہونے کی وجہ سے دو برادریوں کے درمیان ہونے والا معمولی نوعیت کا جھگڑا بھی کئی کئی قتل کروا دینے کے باوجود کئی کئی سال عدالتوں میں مقدمات کا باعث بنا رہتا ہے اور اکثر اس جھگڑے کو انا کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے کہ فلاں قوم یا برادری نے کس طرح ہمارے بچے کو مارا یا کس طرح ہماری لڑکی کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرات کر لی اور انکے اس عمل کے بدلے میں جارحانہ رویے اختیار کرتے ہوئے کارروائی کی جاتی ہے اور اگر ایک برادری کا کوئی بندہ قتل ہو گیا ہو تو دوسرے بھی بدلے میں ان کا بندہ قتل کریں گے ورنہ اس کے سارے خاندان کو جیل میں بند کروا دیتے ہیں۔ اس طرح اگر ان کی لڑکی دوسری برادری والے بھگا کے لے گئے ہوں تو وہ بھی ان کی لڑکیوں کو اٹھا کے لے جانے کی کوشش کرتے ہیں یا اس لڑکے پہ ایسا کیس بنوا دیتے ہیں کہ اس کا پورا خاندان ساری عمر تھانے کچہری کے چکر لگا کے وقت گزارتا ہے۔

اگر فوری طور پر پہ اس برادری سے بدلہ نہ بھی لیا جا سکے اور کئی سال بعد ان کے بدلے میں بندہ مار کے یا اس لڑکے کے کئی بچے بھی ہو جائیں تب بھی اس لڑکے اور لڑکی کو بچوں سمیت مار دیا جاتا اور ایسا صرف قبائلی علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں میں ہوتا ہے۔ عموماً کچھ برادریوں میں اگر لڑکی کسی اور لڑکے کے ساتھ چلی جائے تو چند دن میں اس کا

سراغ لگا کے واپس بھی لے آتے ہیں اور پھر جرگہ میں بیٹھ کے فیصلہ کر کے کبھی کبھی تو اس لڑکے ساتھ اکثر کسی دوسرے کزن کے ساتھ اس کا خاموشی سے نکاح کر دیا جاتا ہے۔ اکثر برادریوں میں جھگڑوں میں تھانہ کچہری کی بجائے جرگے میں کوئی جرمانہ بھی ادا کر کے جیسے پٹھانوں کے اکثر قباول میں کسی دوسری برادری سے جھگڑا ہونے کے بعد صلح کے لیے کئی من گوشت اور چاول مثال کے طور پر دو بھینسیں یا چار دیگ چاول یا دونوں بھی پکا کے اس برادری کے لوگوں کی دعوت کر کے سب کے سامنے معافی مانگی جاتی ہے۔

بعض سیاسی وابستگی رکھنے والے گروپس ہو یا کسی منفی کاروبار/ (منشیات فروشی) میں ملوث گروہ وہ اپنے کاروباری حریف کو تنگ کرنے کے لیے بلاوجہ بھی جھگڑا کر لیتے ہیں یا کسی اور بندے کے جھگڑے کو پکڑ کے بھی اپنے حریف کے خلاف قانونی کارروائی کرتے ہیں۔ سامنے تو اور مسئلہ رکھا ہوتا ہے مگر در پردہ وہ اپنے حریف کو قانونی داؤ پیچ میں الجھا کے اپنے کاروباری یا سیاسی اہداف پورے کر لیتے ہیں بعض اوقات ان کیسز میں بارگینگ کر کے صلح کر لی جاتی ہے جیسا کہ اگر تم میرے مقابلے میں الیکشن میں حصہ نہیں لو گے یا جس علاقے میں میرا دھندا چلتا ہے تم وہاں کام نہیں کرو گے کبھی کبھی تو مخالف فریق ضد پہ اڑ جاتا ہے نہ صرف اس بندے کے خلاف جوابی کارروائی کرتا ہے بلکہ پولیس جب انھیں مقدمے کی صورت میں گرفتار کرنے آتی ہے تو وہ ان پر بھی فائرنگ کرتے ہیں۔ کئی کئی گھنٹے ان کا مقابلہ ہوتا ہے۔ دونوں گروپس کا بھی آپس میں اکثر اوقات فائرنگ کا تبادلہ ہوتا ہے اس مقصد کے لیے انھیں اسلحے کی بھاری مقدار چاہیے ہوتی ہے لہذا وہ قانونی ہو یا غیر قانونی ہر وقت اسلحہ لے کر ہی گھومتے ہیں۔ کلاشنکوف تک رکھی ہوتی ہے۔ ان کے اس مقابلوں میں اکثر راہ گیر بے گناہ اور راہ گیر بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور چھتوں پر کھڑے تماشہ دیکھنے والے لوگ بھی مارے جاتے ہیں جن کے کبھی بھی مقدمات درج نہیں ہوتے،

نہ ہی ان لوگوں کے خلاف پولیس کوئی کارروائی کرسکتی ہے۔ انھوں نے پولیس والوں سے ماہانہ بھتہ طے کیا ہوتا ہے یا پھر اثر ورسوخ استعمال کروا کے بچ جاتے ہیں اور پھر مرنے والوں کے خاندان کو بھی جرگے وغیرہ میں لے دے کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ کچھ خاندان مخصوص ہیں ثالثی کے حوالے سے یا جرگوں کا فیصلہ کرنے کے حوالے سے وہ سیاسی طور پر بھی سرگرم ہوتے ہیں اور معاشی طور پر بھی مستحکم اور نسل درنسل یہ کام انھیں ورثے میں ملا ہوتا ہے۔ ان کے گھر پر لوگ اپنے مسئلے لے کر جاتے ہیں بجائے قانون کے لمبے چوڑے چکروں میں پڑنے کے کہ وہ کسی راجہ چوہدری ملک یا خان صاحب کی حویلی میں فیصلہ کر لیتے ہیں چاہے اس میں انھیں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ تعلیم کی شرح میں اضافے کی وجہ سے اب جرم کی شرح میں تھوڑی بہت کمی ہوگئی ہے مگر جھگڑوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوسکا۔ اسے ختم کرنے کے لیے شاید ہمیں اپنے غصے کو کنٹرول کرنا ہوگا ورنہ یہ جھگڑے بھی ہوتے رہیں گے پولیس بھی بھتہ کماتی رہے گی اور ہمیں خانوں، چوہدریوں اور ملکوں کی بھی غلامی جاری رکھنا پڑے گی۔

مزدوری/مزدور

ان آبادیوں میں پچاس فیصد سے زائد طبقہ اپنی روزی روٹی صرف مزدوری کر کے حاصل کرتا ہے۔ پچیس سال قبل شاید یہ اس سے بھی زیادہ تناسب ہوگا۔ مزدوری کئی قسم کی ہے زیادہ تر بوجھ اٹھانے والے مزدور ہیں۔ اردگرد بہت سے بازار گندم منڈی، غلہ منڈی، سبزی منڈی اور فروٹ منڈی، نرنکاری بازار اور دوسرے ہول سیل کے بازارات ہیں اس کے علاوہ کپڑے، آٹے، دال اور چینی کی ملیں وغیرہ جو کبھی شہر سے باہر جنگل میں ہوا کرتی تھیں۔ اب شہر پھیلنے کی وجہ سے قریب آ گئی ہیں۔ ان کے اردگرد بھی آبادیاں بن چکی ہیں اس لیے ہمارے اَن پڑھ لوگ جو کوئی ہنر بھی نہیں جانتے، وہ بوجھ اٹھانے والی مزدوری کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر اپنے کندھوں پہ بوریاں اٹھا اٹھا کے مل اور بازاروں میں کھڑی گاڑیوں پہ لوڈ اور اَن لوڈ کرتے ہیں جس کے عوض انھیں اکثر سو، پچاس روپے مل جاتے ہیں۔

دوسرے ذرا بہتر مزدور ہوتے ہیں جس کے پاس اپنے ذاتی یا کرائے کے ہاتھ ریڑھے ہوتے ہیں اور وہ سامان اس پر لاد کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ انھیں معاوضہ پر مزدوری کرنے والوں سے ڈبل ملتا ہے مگر وہ ایک ریڑھے کے ساتھ دو، تین یا چار بھی مزدوری کر رہے ہوتے ہیں۔ انھیں فی چکر آٹھ سو بھی مل جاتے ہیں تو دو، دوسو روپے فی کس آتا ہے جس میں سے ریڑھے کا کرایہ یا اقساط بھی ادا کرنی ہوتی ہیں اور مرمت بھی خود کروانا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک درمیانے درجے کے مزدور ہوتے ہیں جن کے پاس خالی

ٹوکرے ہوتے ہیں۔ وہ بازار میں آنے والی خصوصاً خواتین اور بالعموم دوسرے گاڑی والوں کا بھی سامان اٹھا کے چند روپوں کے عوض ان کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچاتے ہیں ایسے مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے بہت کم پیسوں میں لوگ ان سے سامان اٹھواتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف بازاروں، روڈز کے کنارے یا کسی مرکزی چوک وغیرہ میں آ کر بہت سے لوگ لائن میں بیٹھے نظر آ جائیں اور ان کے ہاتھوں میں کڑاچی بیلچہ یا رنگ والا برش اور ڈبہ پکڑا ہوا تو آپ سمجھ جائیں گے یہ سارے دیہاڑی دار مزدور ہوتے ہیں جو دو، تین سو روپے دیہاڑی لے کر مکانات کی تعمیر سے لے کر کھدائی بھرائی، چونا اور دوسرے کاموں میں کاریگروں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ سارے دیہاڑی دار مزدور ہوتے ہیں جنھیں اکثر لوگ دیہاڑی کے علاوہ کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بے چارے کسی ٹھیکیدار کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جس نے تھوڑے وقت میں زیادہ کام لینا ہوتا ہے تو وہ چودہ چودہ گھنٹے بھی کام کرتے ہیں اور روٹی بھی اپنے پیسوں سے کھاتے ہیں۔ اس میں انھیں نقصان ہوتا ہے مگر ٹھیکیدار کے ساتھ لگ جانے کی وجہ سے انھیں کئی دن مزدوری نہیں ڈھونڈنی پڑتی اس لیے وہ کم پیسوں میں مسلسل کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اکثر بورنگ والے ٹھیکیدار کے ساتھ بھی اور روڈ پر روڑی کوٹنے کے کام بھی کر رہے ہوتے ہیں۔

چونا وغیرہ کرنے والے عموماً دیہاڑی طے کرتے ہیں اس میں ایک کمرہ رنگ کرنے کا دو، تین سو سے لے کر رنگ کر دیتے ہیں ٹھیکہ عموماً مزدوروں کو نہیں ملتا اس کے لیے کاریگر ہونا ضروری ہے۔ کاریگروں کے پاس صرف چند اوزار ہوتے جیسے کرمالہ کڑھائی، کرنڈی، گھوڑی وغیرہ بہت کم مزدور مسلسل محنت کے بعد مستری یا کاریگر بنتے ہیں۔ اس کے لیے سالوں کی محنت کے ساتھ تجربے اور اپنے کام میں نام پیدا کرنے سے آپ کو مستری یا کاریگر مانا جاتا ہے اور چھوٹے ٹھیکے ملتے ہیں۔ عموماً بیس بیس سال لوگ مزدوری

ہی کرتے رہتے ہیں۔کھدائی والے مزدور جو صرف پٹھان یا افغانی ہوتے ہیں وہ ایک دو سال میں ٹھیکے دار بن جاتے ہیں۔کھدائی ٹھیکے پہ کرتے ہیں۔سینکڑوں کے حساب سے پے منٹ کی رقم لیتے جسے سو فٹ کے تین روپے فی فٹ لگا کے تین سو کا سینکڑا بولتے ہیں اور تین سو روپے مزدوری لیتے ہیں۔انھیں روٹی فراہم کرنا ٹھیکے دار کی ذمہ داری نہیں وہ خود کھاتے ہیں کیونکہ دیہاڑی میں فکس رقم ہوتی ہے جبکہ ٹھیکے میں دیہاڑی سے زیادہ مل جاتے ہیں۔ اس لیے وہ پیٹ بھر کے چار، پانچ روٹیاں کھا لیتے ہیں۔مزدور تو مزدوری اسی لیے کرتے ہیں پہلے اپنا پیٹ بھرتے ہیں پھر اپنے گھر والوں کی فکر کرتے ہیں۔اس کے علاوہ لوکل گاڑیوں، بسوں، ویگنوں، ٹرکوں، سوزکیوں کے ہمراہ ڈرائیور کی مدد کرتے ہیں۔ایک دیہاڑی دار ملازم ہوتا ہے جیسے کنڈیکٹر کہتے ہیں، یہ عموماً کئی کئی سال دیہاڑی پہ ہی ہوتا ہے پھر آدھا ڈرائیور ہو جانے کے بعد اسے پانچ، چھ ہزار ماہانہ پر ملازمت ملتی ہے۔

دوکان دار بھی روزانہ کی بنا پر سیلز مین رکھتے ہیں۔کئی ماہ کی مسلسل خدمت مالک کے بچے کھیلانے اور گھر کا سودا سلف تک لانے کے بعد اس دیہاڑی والے سیلز مین کو تنخواہ دار ملازم بننے کا موقع ملتا ہے۔اسی طرح ملز میں بھی صرف مزدوری ہی ملتی ہے۔وہ آدھی عمر دیہاڑیوں میں لگا لیتے ہیں۔ملز مالک تو خواب میں بھی نہیں بن سکتے۔پکے مزدور بننے میں آدھی زندگی لگ جاتی ہے۔میں نے جن بچوں کے ساتھ کھیل اور بعد میں کچھ کو پڑھایا وہ سارے مزدوروں کے بچے تھے اور مجھے اقساط میں فیس ملا کرتی تھی ان کے والدین کی داڑھی موچھیں کالی تھیں۔وہ کئی من وزن ریڑھے پہ لادھ کے کھینچ لیتے تھے۔آج وہ بچے جوان ہو گئے ہیں۔تھوڑی بہتر مزدوری ڈرائیوری، درزی یا کسی مل میں ملازم ہو گئے ہیں ان کے والد آج بھی داڑھی سفید ہو جانے کے باوجود منوں کی جگہ دھڑیوں میں وزن ہی اٹھا رہے ہیں اور اکثر انھیں مالک ترس کھا کے کچھ گلے سڑے پھل اور سبزیوں کے علاوہ

دالیں، چاول یا گندم اور آٹا وغیرہ جو نیچے گر کے گندا ہو جاتا ہے وہ دے دیتے ہیں تو وہ اپنی پرانی چادر جو بوریاں اٹھاتے اٹھاتے کندھے پر رکھتے ہوئے پھٹ چکی ہوتی ہے اس میں جگہ جگہ چھوٹی گرہیں لگا کے باندھ لیتے ہیں اور اپنے گھر جا کر اپنی شریک حیات کو دیتے ہیں جو گھر میں استعمال کر لیتی ہے۔

☆☆☆

۶۔ مئی ۲۰۱۱ء